مخزن

عروس البلاد

لندن

میرے ایک مہربان بزرگ نے مجھے ہندوستان سے چلتے وقت خط لکھا۔ کہ لنڈن جاتے ہو۔ آخر "عروس البلاد" کا جادو تم پر بھی چل گیا اور تم بھی اس کی طرف کھنچ گئے۔ خدا جانے اس شہر میں کس بلا کی کشش ہے۔ معلوم نہیں۔ یہ خطاب لنڈن کو پہلے بھی دیا جا چکا ہے۔ یا ہمارے فاضل دوست کی طبع ایجاد پسند کا نتیجہ ہے۔ مگر مجھے یہ مناسب معلوم ہوا۔ کہ لنڈن کے متعلق مضمون لکھنے کے لئے یہ عنوان اختیار کر لیا جائے۔ کیونکہ نرا "لندن" تو کچھ روکھا پھیکا سا عنوان ہے۔ گو میں نہیں کہہ سکتا کہ دار السلطنت انگلستان کس حد تک اس خطاب کا مستحق ہے۔ عروس کے لفظ سے جو پہلا خیال آدمی کے دل میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ خوبصورتی یا آراستگی ہے اور اگر اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شاید پیرس اس خطاب کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ یہ مسلمہ بات ہے کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر آراستہ۔ بانکا اور طرحدار شہر نہیں ہے۔ اور جو ایک اڑتی سے جھلک پیرس کی ادھر آتے ہوئے ہمیں نظر آئی ہے۔ وہ نہایت دلکش تھی۔ لندن اس کے مقابلہ میں خوبی اور بانکپن میں نہیں جنچتا۔ ہاں لندن باعتبار اپنی عظمت و شان اور کثرتِ کاروبار و تجارت کے ایک حیرت انگیز ہے۔ اور اس حیثیت سے جو نام بھی اسے دیدیا جائے سزاوار

ہی۔ ایک نصف کروڑ کی آبادی۔ جس میں زن و مرد لڑکے لڑکیاں سب باہر چلنے پھرنے والے ہیں۔ جس قدر ہجوم کوچہ و بازار میں پیدا کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے۔ اور اس انبوہ کثیر کے اِدھر اُدھر آنے جانے کے لئے جتنی ضرورت سواری کے سامان کی ہوگی۔ وُہ بھی محتاجِ بیان نہیں۔ اور یہ سب اہتمام اس عُمدگی اور ارزانی سے کیا گیا ہے کہ بیساختہ حُسنِ انتظام کی داد دینی پڑتی ہے۔ اتنی آبادی کے لئے مکان بہم پہنچانا ایک اہم مسئلہ ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسے انگلستان بھی باوجُود اپنی بیشمار دولت کے پُوری طرح حل نہیں کر سکا۔ مکان کے جو معنے مشرق میں لئے جاتے ہیں۔ اُس معنے میں سوائے امرا کے یہاں بہت کم لوگ مکان رکھتے ہیں۔ ایک ایک گھر میں کئی کُنبے بستے ہیں۔ اکثر کے پاس تو ایک کمرہ ہوتا ہے۔ اور بہت سے ایسے بھی بدقسمت ہیں جو اتنا بھی آسرا نہیں رکھتے۔ جہاں رات ہوگئی۔ وہاں ہی گھر ہے۔ جا بجا کمرے رات بھر کے لئے کرایہ پر ملتے ہیں۔ جنمیں بستر مل جاتا ہے۔ کرایہ دیا۔ پڑ رہے۔ اور صبح ہوتے ہی پھر چل کھڑے ہُوئے۔ اِنکے سوا ایک اَور جماعت ان سے بھی زیادہ بدنصیب ہے۔ ان کے پاس اس طرح بستر کرایہ پہ لینے کی بھی توفیق نہیں۔ اور وُہ رات یُونہی چل پھر کر کاٹ دیتے ہیں اور دن کو بنچ وغیرہ پر جو کہیں کہیں رہگزروں کے آرام کے لئے رکھے رہتے ہیں پڑے اُونگھتے ہیں۔ گرمی کے دِن تو اِنکے خیر کٹ جاتے ہیں۔ جاڑا آتا ہے تو بلا آتی ہے۔ بیسیوں ٹھٹھر کے رہ جاتے ہیں اور قیدِ زیست سے آزاد ہو جاتے ہیں۔ اور سینکڑوں کی جان یُوں بچتی ہے۔ کہ سرکاری طور پر انتظام کیا جاتا ہے۔ کہ ہر محلے میں ایک بڑا کمرہ گرم کیا جائے۔ ملازمانِ پولیس انہیں گھیر گھار کے آگ کے گرد لیجا بٹھاتے ہیں اور آگ تاپتے ہُوئے یہ لوگ رات بھر بیٹھے رہتے ہیں اور دن ہوتے ہی۔ پھر یہ ہوتے ہیں اور اِن کی آوارہ گردی اور بیکاری۔ دولت اور جاہ و حشمت کا جو نظارہ لندن کے مغربی حصے میں نظر آتا ہے۔ وُہ بھی دو تین اَور مغربی شہروں کے سوا کہیں دُنیا بھر میں نظر نہیں آسکتا۔

لیکن تنگدستی - افلاس اور بدقسمتی کی جو دلخراش تصویر لنڈن کا مشرقی حصہ پیش کرتا ہے اس کا بھی نظیر دنیا میں ملنا محال ہے - ہمارا ملک بہ حیثیتِ مجموعی بیشک مفلسی کا شکار ہے اور ہماری قوم دولتمند نہیں - مگر نہایت مالدار لوگوں کی ہمسائیگی میں اس درجہ کی بیکسی اور بے بسی ہمارے ہاں نہیں - اور اگر اس زمانہ میں جاہ و ثروت کا لازمی نتیجہ یہ ہے - کہ قوم کا ایک حصہ بالکل خوار خستہ ہو جائے تو ہم ایسی ثروت سے باز آئے +

لنڈن دن کے وقت - مَیں یہاں ۲۹ - مئی کی رات کو پہنچا تھا - اُس وقت تو سفر کی ماندگی غالب تھی اور ٹھکانے کی فکر تھی - کیا دیکھ سکتے تھے - قریب ترین ہوٹل میں پڑ رہے صبح ہوتے ہی شوقِ سیر نے گدگدی کی اور میں باہر نکلا - کرایہ پر جو یہاں گاڑیاں چلتی ہیں - اُن میں سب سے مقبول اور پرانی چیز ایک ہے جسے اُمنی بس یا صرف بس کہتے ہیں - اُنکی بدولت یہاں بڑا آرام ہے - ورنہ ایک حصہ شہر میں اور دوسرے میں میلوں کا فاصلہ ہے - پاؤں پیادہ چلو تو دن ختم ہو جائے اور معمولی اکیلی سواری کی گاڑی ڈھونڈھو تو جیب خالی ہو جائے - انکا یہ ہے کہ آنہ دو آنے دیئے اور جا پہنچے - بارہ آدمی اندر اور چودہ آدمی چھت پر بیٹھ سکتے ہیں - اور صبح سے لیکر رات کے گیارہ بارہ بجے تک بھری ہوئی نظر آتی ہیں - سب سے پہلی جو بس ملی - اُس پر سوار ہو لیا اور لنڈن پر ایک سرسری نظر ڈالنی شروع کی - پہلا نقش جو میرے دل پر ہوا - وہ کسی قدر مایوس کرنے والا تھا - مَیں نے کہا یہی لنڈن ہے - جسکی اتنی تعریفیں سُنتے تھے اور یہی ہے - جس کا نام ہمارے عنایت فرمانے عروس البلاد رکھا تھا - انکے خیال میں عروس ہو تو معلوم نہیں - ہمیں تو عجوز البلاد کی پھبتی زیادہ موزوں معلوم ہوتی ہے - جدھر نظر جائے اُونچی اُونچی عمارتیں دھوئیں اور کثرتِ نم سے سیاہ - سڑکیں سیاہ - ہوا میں سیاہ ذرات - سانس لو تو سیاہی حلق اور نتھنوں میں گھس جائے - رومال سے صاف کرنا چاہو تو رومال سیاہ ہو جائے - بعض عمارتیں جو نئی تھیں وہ بھی اس رُوسیاہی کے دھبے سے خالی نہ تھیں - پُرانی تعمیروں کا تو کیا کہنا - پُرانی تاریخی عمارتیں - جیسے

سنٹ پال کا گرجا - وسٹ منسٹر کا قبرستان - پارلیمنٹ - قصرِ بکنگھم سب سیاہ نظر آئے - اُوپر سے مطلع بھی ابر آلود تھا اور ترشح بھی جاری تھا - ظاہر ہے کہ ایک مشرقی آنکھ پر جو سنگ سُرخ اور سنگ سفید کی صدیوں میں رنگ نہ بدلنے والی عمارات کے نظارہ کی عادی ہو - ایسے اسباب کا سوائے مایُوسی کے اَور کیا اثر ہو سکتا تھا - یہ نہیں کہ مَیں ان عمارات کی ساخت اور ان کے نقشے کی عمدگی یا اِن کی غیر معمولی بلندی کی تحسین نہیں کرتا تھا - لیکن چُونکہ میرا علم تصاویر پر مبنی تھا - اور تصاویر عمارات کی خُوبی کو دکھاتی تھیں اور سیاہی کے بدنما داغ کو چھپاتی تھیں - اِس لئے میرا دل یہ کہ رہا تھا کہ ان چیزوں کو جیسا سُنتے تھے نہ پایا - بعد غور حقیقت یہ کُھلی - کہ لندن اس بارہ میں معذور و مجبُور ہے - اگر لندن کو لندن بننا تھا تو اسے عمارات کے ظاہری حُسن سے بے پرواہ ہونا بھی لازم تھا - اِس شہر کی بڑائی منحصر ہے - اس کے مرکزِ تجارت ہونے پر اور تجارت یہاں منحصر ہے صنعت پر اور صنعت کلوں پر اور کلیں دُخان پر - ہزاروں لاکھوں چھوٹے بڑے انجن ہیں جو شب و روز چل رہے ہیں - اور دُھواں اُن کی چمنیوں سے نکل کر ہوا میں مِل رہا ہے - اس کے علاوہ گھر گھر میں ایک دُودکش ہے - اور باورچی خانہ یا انگیٹھی کا دُھواں دُودکش کے ذریعے اُوپر جا رہا ہے - یہ نہیں کہ ہندوستان کے عام گھروں کی طرح چھتیں اور کڑیاں دُھوئیں کے مارے سیاہ روغن سے رنگی جا رہی ہیں - یہاں گھروں میں جالے اور دُھوئیں کا نشان نہیں - ہر کمرہ میں فرش ہے - ہر دیوار پر کاغذ منڈھا ہوا ہے - ہر چھت اندر کی طرف سفید کپڑے سے ڈھنپی ہے - زینوں میں بانات وغیرہ لگی ہے - دروازہ میں فرش ہے - غرض صفائی کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا گیا ہے - پس جب کارخانوں سے بھی اور گھروں سے بھی ہر وقت دُھوئیں کے بادل اُٹھتے رہتے ہیں - تو ہوا کیا کرے - کیونکر صاف رہے - اور جب ترشح شروع ہوتا ہے تو یہ کالے ذرات بھاری ہو کر مکانات اور زمین پر بیٹھنے لگتے ہیں اور مکانات کو باہر سے دنوں میں سیاہ کر دیتے ہیں - نتیجہ یہ ہے کہ جتنی پُرانی کوئی عمارت ہے - اتنا ہی گہرا پردہ

سیاہی کا اُس پر پڑا ہوا ہے اور جو نگاہ رنگ کی خوبصورتی کو ڈھونڈھتی ہے۔ اُسے یہاں کے باشندوں کے سُرخ و سپید چہروں کے غازے سے تازگی حاصل کرنی چاہیئے نہ کہ عمارات سے +

ایک نقش تو لندن کو دِن کے وقت دیکھنے سے یہ ہوا۔ کہ یہ کچھ کالا کلوٹا سا شہر ہے۔ اور دُوسرا یہ کہ نہایت مصروف شہر ہے۔ جس شخص کو دیکھو دوڑا جا رہا ہے دوپہر کے قریب کاروبار کا زور ہوتا ہے۔ اُسوقت کسی بازار میں ایک آدمی بھی مشکل سے ایسا نظر آتا ہے جو آہستہ چل رہا ہو۔ کیونکہ سب تیز چلتے ہیں اور جو آہستہ چلنا چاہے۔ اس کے لئے یہاں کوئی جگہ نہیں۔ ضرور دھکّے کھائیگا۔ یہاں تو یہی ہے کہ راستہ لیتا جائے اور راستہ دیتا جائے۔ آہستہ خرامی کا یہاں ٹھکانا نہیں۔ تیز روی کی زبردست رَو اسکو یُوں بہا لیجائے گی۔ جیسے خس و خاشاک سیلاب کے آگے آگے چل پڑتے ہیں۔ روزِ محشر کی نفسا نفسی تو مدّتوں سے سُنتے تھے۔ یہاں ہر روز قیامت کی گرم بازاری ہے۔ عجب سبق حاصل ہوتا ہے۔ ع رہا جو پسِ کارواں رہ گیا +

علاوہ بریں لندن دِن میں نہایت بھلا مانس شہر ہے۔ کسی کو کسی سے مطلب نہیں۔ ہر ایک کو اپنے کام سے کام ہے۔ بازاروں میں نہ صرف کاروباری لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ بلکہ اُمرا اور شُرفا اور اُنکی بیبیاں اور بچّے سب اپنا سامان خریدنے کے لئے نکلتے ہیں۔ ہر شخص دُوسرے سے اخلاق سے گفتگو کرتا ہے۔ خواہ اجنبی ہو۔ اور لوگ مسافر کو بہت توجہ سے راستہ بتاتے ہیں۔ دُنیا کے ہر حصّے کے لوگ فرانسیسی۔ ارمنی۔ جرمنی۔ گبر و ترسا و یہُود۔ ہندی۔ چینی۔ جاپانی۔ ترک و عرب و حبش۔ غرض ہر رنگ کے لوگ اور ہر زبان کے بولنے والے اِس زمانۂ جدید کے بابل کے گلی کوچوں کی رونق کو بڑھاتے ہیں۔ شہر کے باغات اور پارک دن کے وقت (سوائے تعطیل کے اوقات کے) کس مُپرسی کی حالت میں ہوتے ہیں۔ البتّہ شام ہوتے ہی اُدھر رجوعِ خلائق ہوتا ہے

اور ہر باغ میں ہزارہا لوگوں کا مجمع ہو جاتا ہے۔ کوئی وعظ سُنتے ہیں۔ کوئی مذہبی گیت گاتے ہیں۔ کوئی گھاس پر لیٹتے ہیں۔ کوئی باجا سُنتے ہیں۔ کوئی بنچوں پر بیٹھے ہوئے دِن کی کوفت ہٹاتے ہیں اور کوئی ورزش کے لئے چکر لگاتے ہیں۔ مگر شام کے بعد کا نقشہ ہی اَور ہے ✦

لندن رات کے وقت ۔ رات کو وُہ دن کا کالا کلوٹا لندن ہی نہیں رہتا۔ سیاہی کو تو سیاہیِ شب ڈھانپ لیتی ہے۔ اور روشنی تاریکیٔ شب سے فایدہ اُٹھا کر دُگنی آب و تاب سے چمکتی ہے۔ ہر ہوٹل۔ ہر تھیٹر۔ ہر میخانہ ایک بُقعۂ نُور نظر آتا ہے۔ ان مقامات کو روز ایسی ایسی ترکیبوں سے روشن کیا جاتا ہے۔ جیسے ہم کبھی کبھی دیوالی یا شب برات کی تقریبوں یا جشن شاہی وغیرہ کے لئے چراغان کرتے ہیں۔ قطار در قطار چراغان کوئی لال۔ کوئی ہرے۔ کوئی پیلے شیشوں کے پیچھے رکھے ہُوئے عجب بہار دکھاتے ہیں۔ بعض جگہ ایسے انداز سے روشنی کیجاتی ہے کہ دکان کا نام نشان آتشیں حروف میں دُور سے نظر آئے۔ بعض اَور بھی ستم کرتے ہیں۔ ایسی کل رکھ دیتے ہیں۔ کہ حروف دم بدم بدلتے رہیں اور اس طرح ہر وقت انکے کارخانہ کا اشتہار ہوتا رہے۔ آدھی آبادی ہوٹلوں میں کھانا کھاتی ہے۔ بعض مجبور ہیں کہ اَور سامان نہیں رکھتے اور بعض شوقیہ جاتے ہیں۔ جو شوقین ہیں۔ وُہ ایسے ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ جہاں پندرہ بیس روپے ایک وقت کے کھانے میں اُڑ جاویں۔ نو بجے تک سب لوگ ہوٹلوں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں اور اسوقت سے تھیٹروں کا بازار گرم ہوتا ہے۔ یہاں ایک بجے تک تھیٹر میں نہیں ہٹھا رکھتے۔ گیارہ بجے سب ختم کر دیتے ہیں۔ یہ وقت لندن کی عیاشی اور آوارگی کا ہے۔ جو لوگ دن کو نہایت مصروف نظر آتے تھے۔ اُن میں سے اکثر اسوقت فارغ البال دکھائی دیتے ہیں۔ رفتار میں اٹکھیلیاں ہیں۔ نظر میں بیقراری اور جستجو ہے۔ دِل میں شوق اور بدن میں مصنوعی حرارت

جو آتشِ سیّال سے پیدا کی گئی ہے - اِسوقت ان سے ذرا بچ کر نکلنا چاہئے - پولیس کو بھی اسوقت ہوشیار رہنا پڑتا ہے - طرح طرح کے گیسہ بُر اسوقت اپنے شکار کے لئے نکلتے ہیں چند بازار دُنیا بھر کے بدمعاشوں کا مرجع ہیں - اور وہاں جو اکیلا دُکیلا مُسافر اُنکے ہتھے چڑھ جائے تو انکی چاندی ہے - اسوقت جو لنڈن کی ظاہری خوشنما زینت ہو اسکو دیکھ کر بیشک اُسے عروس کا خطاب دیا جا سکتا ہے - مگر اس کے ساتھ جو آوارگی لگی ہوئی ہو - اُس کے باعث اسے ایک اصلی اور باعصمت عروس نہیں کہ سکتے - بلکہ وُہ عروس جس کی شان میں یہ کہا جا سکے ع

کہ ہر بامدادش بُود شوہرے *

لندن کے ذرائع سفر - لنڈن کے مختلف حصّوں کے درمیان جو مسافت ہو اس کے بُعد کا ذکر مَیں کر چکا ہوں - اب دیکھنا یہ ہے کہ وُہ ذرائع کون کون سے ہیں جن سے لوگ اِدھر اُدھر سفر کرتے رہتے ہیں - کوئی کاروبار والا آدمی یہاں ایسا نہیں جو دن میں تیس چالیس میل کا سفر شہر کے اندر اندر ہی نہ کرتا ہو - اس کے لئے کیا بندوبست ہے - ایک ذریعہ کا تو ذکر آچکا ہے - یعنے بس - یہ گاڑیاں چار ہزار کے قریب ہیں - جن کے لئے تیس ہزار گھوڑے کمپنیوں کو رکھنے پڑتے ہیں - اور انکی اوسط آمد اڑھائی سو روپیہ فی ہفتہ ہے - اِن کے سوا گاڑیاں ہیں - جن کی تعداد پچھلے سال کے شمار کے مطابق بارہ ہزار کے قریب تھی - آٹھ ہزار دو پیّہ اور چار ہزار چو پیّہ - ان پر تیرہ چودہ ہزار کوچوان مقرر ہیں - جن کی اوسط آمدنی روزانہ پندرہ روپیہ فی کس ہے - ان کے علاوہ کئی ریلیں ہیں - بعض زمین کے اوپر چلتی ہیں اور بعض نیچے *

ہر دس دس پندرہ پندرہ منٹ کے بعد گاڑی چھوٹتی ہے - اور اس پر بھی بعض اوقات جگہ پانی مشکل ہوتی ہے - ریلوں کے سوا ایک اور تہ زمینی گاڑی ہے - جو بجلی کے زور سے چلتی ہے - یہ سارے شہر میں تو نہیں جاتی لیکن شہر کے آباد ترین حصّوں کے نیچے پھر نکلی ہو - اور ہر دو تین منٹ کے بعد اس کی بھری ہوئی ٹرین چلتی رہتی ہے - کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ

ہم زینے سے اُتر کر نیچے جا رہے ہیں کہ گاڑی آئی اور نکل گئی۔ مگر تین چار منٹ سے کبھی زیادہ اِنتظار نہیں کرنا پڑا کہ دوسری گاڑی آگئی۔ اب موٹر گاڑیاں بھی کرایہ پر ملنے لگی ہیں اور کئی حصّوں میں ٹیم بھی زور شور سے چلتی ہے۔ ٹریم بجلی سے چلنے والی بھی ہے اور وُہ بھی ہے جسے گھوڑے کھینچتے ہیں۔ اور ابھی شکایت ہے کہ سامان سواری کا کم ہے۔ ٹریم کی اور بجلی والی تہ زمینی ریل کی توسیع ہونی چاہیئے۔ مگر یہ سارا اہتمام تو عوام کے لئے ہے خواص کی جو اپنی دو اسپہ اور چار اسپہ بگھیاں۔ اور بانکی موٹر گاڑیاں ہیں۔ اُن کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔

لندن کا طریقِ دُکانداری۔ حرکت اور برکت کا یہ زور شور جس کا ذکر اُوپر ہُوا۔ سب تجارت کے باعث ہے۔ اور تجارت ہی میں انگلستان کی بڑائی کا راز پنہاں ہے۔ تجارت کے اُن شعبوں کا ذکر جن سے یہاں کے بڑے کارخانے اور جہازوں کے قیام گاہ آباد ہیں۔ تو علیحدہ مضمون چاہتا ہے۔ سر دست اس کے ایک چھوٹے سے صیغے کو لیتا ہوں۔ یعنی دُکانداری۔ جُوں جُوں یہاں کے کاروبار کے اس حصّے کو دیکھتا ہوں۔ دِل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ کوئی ایسا ذریعہ ہو کہ اپنے ملک کے دُکانداروں کی ایک جماعت کو یہاں لاکر یہ نمونہ دکھاؤں۔ کہ اس طرح کام کرنا چاہیئے۔ پہلی چیز جو دیکھنے اور اخذ کرنے کے قابل ہے۔ وُہ دُکان سجانے کا طریق ہے۔ ہر دکان کے باہر ایک بڑا دروازہ شیشہ کا لگا ہوا ہے۔ جس میں تمام اُن چیزوں کے نمونے جو دُکان کے اندر مل سکتی ہیں۔ قرینے سے سجے ہیں اور ہر جنس پر قیمت لکھی ہُوئی ہے۔ ہر شخص جو گذرتا ہے۔ دیکھنے کو ٹھہر جاتا ہے۔ گویا ہر دُکان بجائے خود ایک اشتہار مجسّم ہے۔ گو وُہ اس اشتہار پر قناعت نہیں کرتے۔ اِشتہار کے اور وسائل بھی بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو شخص یونہی سجاوٹ کی کشش سے دیکھنے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کی نظر میں کوئی چیز کھُب جاتی ہے۔ یا اُس کی قیمت جچ جاتی ہے اور وُہ اندر جا کر اسے خرید لیتا ہے۔ اس صفائی کے شوق

سے بازار کی خوبصورتی میں ترقی ہوتی ہے۔ چیزیں خراب نہیں ہوتیں اور دُکان کی رونق بڑھتی ہے۔ اگر ہمارے ہاں بڑے شہروں کے بڑے بازاروں میں ہر شخص جو نئی دُکان بنائے اُس میں اس خوبی کا التزام کرے جیسا کہ وہاں بھی بعض انگریزی دکانوں کی ساخت میں کیا جاتا ہے تو کرایہ دار کو بھی فائدہ ہو اور مالکِ دُکان کو بھی۔ مگر جو بات اس سے بہت بڑھ کر ضروری یہاں کی دُکانداری میں ہے۔ وُہ اِن دُکانداروں کی تربیت ہے۔ انکو یہ سکھایا گیا ہے کہ گاہک کا دِل خلق اور تواضع سے موم کر لو۔ گاہک دُکان میں گھُسے تو فوراً دکاندار اُس کی طرف دوڑا آئیگا۔ اور لفظ "سر" کا جس کے معنے جناب یا حضور ہیں۔ ایک تار باندہ دیگا۔ چاہے گاہک پھٹے کپڑے پہنے ہُوئے ہو۔ مَیں نے بعض دفعہ ہندوستان میں دیکھا ہے۔ کہ سفید پوش گاہک کی تو عزت کیجاتی ہے چاہے دو پیسے بھی نہ کھٹوائے اور غریب الحال گاہک کو خواہ وُہ مفید ہی کیوں نہ ثابت ہو کم نگاہی سے دیکھا جاتا ہے۔ ہر چند کہ یہاں کپڑوں سے انسان کی بابت رائے لگانے کا بڑا ہی رواج ہے۔ مگر دُکاندار کو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ اس کے لئے ہر گاہک "سر" ہے۔ اور بات بات میں یہ لفظ ڈالا جاتا ہے۔ اگر آپ بوٹ والے کے ہاں جاویں تو وُہ اپنے ہاتھ سے آپ کا جُوتا اُتاریگا اور پھر اپنے ہاتھ سے دُوسرا جوڑا پہنائیگا۔ اگر آپ کئی جوڑے ناپسند کر دیں تو وُہ اور لیتا آئیگا اور تیوری پر بل نہ لائیگا۔ اگر آپ دیکھ بھال کر بغیر سودا لئے اُٹھ آئینگے تو بھی آپ کو "تھینک یُو" کہے گا۔ یعنی مَیں آپکی تشریف آوری کا مشکور ہُوں۔ آپ کو جوڑا پہنا کر شکریہ وُہ ادا کرتا ہے۔ پیسے لے کر وُہ ادا کرتا ہے۔ باقی واپس دیکر وہ ادا کرتا ہے اور دُکان کے دروازہ تک آپ کو چھوڑتے وقت شکریہ اور سلام وُہ عرض کرتا ہے۔ اور یہ نہیں کہ کوئی ایسے ہیں اور کوئی ویسے۔ ہر دکاندار میں یہ عادت پائیگا۔ اب فرمائیے یہ لوگ کیوں کامیاب نہ ہوں۔ مَیں ایک بہت بڑے چھاپہ خانہ میں تصویروں کی چھپائی کا نرخ دریافت کرنے گیا بہت جا

کام وہاں بجلی کی طاقت سے ہوتا تھا اور وہ کمپنی اس درجہ کی ہے کہ ہمارے ہاں کے سب بڑے بڑے کارخانوں کو ملا کر مول لے لے تو اسے کچھ معلوم نہیں۔ اُن کا مینجر اس توجہ سے ملا۔ کہ کیا بیان کروں۔ حالانکہ اِسے یہ معلوم بھی ہو گیا۔ کہ جو کام اس سے ملنے کی اُمید ہے وہ بہت قلیل ہے۔ جتنے سوال مَیں نے کئے سب کا خوشی سے جواب دیا اور سب جوابوں میں وہی "سر" اور "تھینک یُو" موجود تھا۔ یہ ایک نہایت خفیف سی بات معلوم ہوتی ہے۔ مگر کامیابی کے لئے ایک نادر چٹکلا ہے۔ ایک اور خصوصیت یہاں کی دوکانداری میں ہے۔ وُہ یہ ہے کہ آپ سودا کر کے وُہیں چھوڑ دیجے اور اپنا پتہ لکھوا دیجے۔ آپ کا مال نہایت حفاظت اور احتیاط سے شام کو آپ کے گھر پہنچا دیا جائیگا۔ یہ بھی ایک ایسا طریق ہے۔ جو قابلِ تقلید ہے۔ اِس میں گاہکوں کو نہایت سہولت ہوتی ہے۔ اور بہ حیثیتِ مجموعی دُکاندار کو کچھ بڑا خرچ نہیں اُٹھانا پڑتا۔ مگر گاہک اس سے ممنون بہت ہو جاتے ہیں +

لندن کی پولیس۔ یہ تمام رونق یہ تمام گرم بازاری۔ یہ تمام دلچسپی کے سامان جنکی طرف اُوپر اشارہ ہُوا ہے۔ ہیچ ہوتے اور مُسافروں کو لندن میں رہنا اور چلنا پھرنا محال ہوتا۔ اگر لندن کو خوش قسمتی سے ایسے عُمدہ ملازمانِ پولیس میسّر نہ ہوتے۔ اکثر کہا جاتا ہے۔ کہ لندن کی پولیس دُنیا بھر میں بہترین ہے۔ اور گو ایسے فقرات انگریزوں کی زبان سے عموماً اس مبالغہ کا ایک جُزوِ کثیر رکھتے ہیں جو حبِّ وطن کے جوش سے پیدا ہوتا ہے۔ اور مَیں انہیں بالتمام کم باور کرتا ہُوں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اس میں مبالغہ کی آمیزش نہیں۔ پولیس کا سپاہی لندن میں ایک نعمت ہے۔ اپنے فرایض کا نہایت پابند۔ حلم اور نرمی کا پُتلا۔ اور انتظام کی جان ہے۔ اس کے فرائض یہاں نہایت مشکل ہیں۔ ایک بڑا کام تو اس کے سپُرد یہ ہے۔ کہ وُہ یہاں کی بیشمار آمد و رفت کو باترتیب رکھے۔ چنانچہ اسے وُہ نمایاں خوبی سے انجام دیتا ہے۔ ہر موڑ پر اور ہر چوک میں دِن میں بیسیوں دفعہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف سے بَس۔ ایک طرف سے ٹرَیم۔ کسی طرف سے گھوڑے

گاڑیاں - کسی طرف سے اسباب کے چھکڑے اور سب طرف سے آدمی آرہے ہیں اور خطرہ ہے کہ گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا جاویں - یا آدمی کسی گاڑی کے نیچے آکر کچلے جاویں - مگر پولیس والا ان تمام خطرات کو روکتا رہتا ہے - جو اختیار اسے حاصل ہیں وُہ بھی قابلِ غور ہیں اور جس عمدگی سے وُہ انہیں برتتا اور لوگ مانتے ہیں وُہ بھی قابلِ داد ہے - پولیس والے کی ایک اُنگلی کا اُٹھ جانا علامت ہو کہ اُس طرف کے آدمی - گاڑیاں وغیرہ سب یکبارگی رُک جاویں اور وُہ رُک جاتے ہیں - تب وُہ دوسری طرف کی گاڑیوں کو اشارہ کرتا ہے کہ جلدی سے گزر جاؤ - پھر آدمیوں کو اشارہ کرتا ہے کہ دوڑ کر نکل جاویں اور پھر رُکی ہُوئی گاڑیوں کو چلتا کر دیتا ہے - دن بھر سڑک کے مرکز میں یا موڑ پر یا چوک میں وردی پہنے - سیدھا - بُت بنا کھڑا رہتا ہے - دُھوپ ہو تو سوائے ٹوپی کے کوئی حفاظت نہیں - اسے اپنی جگہ سے ہٹنا نہیں - اور بارش ہو تو باران کوٹ اور بارانی ٹوپی ہر وقت ساتھ ہے - پہن لی اور بارش میں کھڑا ہے - اس کے علاوہ اس کی معلومات راستوں اور سڑکوں کی نسبت بہت وسیع ہیں اور ہر مُسافر کو لازم ہے کہ جہاں ذرا بھی شُبہ ہو اُس سے پُوچھ لے - وہ نہایت کشادہ پیشانی سے سب کچھ بتاتا ہے - کاش ہماری سرکار ہندوستان کی پولیس کو اس نمونہ پر ڈھال لے - کہ وہ حقیقت میں رعیّت کے پاسبان بن جاویں - اگر لندن پولیس کے تجربہ کار افسروں کو کسی ترغیب سے اور زیادہ تنخواہ پر وہاں کی پولیس میں لیا جائے اور انہیں یہ ہدایت کیجاوے - کہ وہ اپنے ہاں کے ملازموں کا نمونہ وہاں داخل کر دیں - تو غالبًا اچھّا نتیجہ ہو مگر یہ تحریک اخبارات کا حصّہ ہے ۔

لندن کے میلے - لندن میں مہذب میلے روز رہتے ہیں - دو تین جگہ کسی نہ کسی قسم کی نمائش جاری رہتی ہے - جس میں ہزارہا لوگ ہر روز شام کو جمع ہوتے ہیں اور تفریح اور تعلیم دو نو مطلب اُن سے نکلتے ہیں - ہر شنبہ کے روز دو بجے کے بعد تمام باغات میں گویا نرا زور ہوتا ہے - اور اتوار کو خصُوصًا گرما میں بہت سے لوگ

کشتیوں میں بیٹھ کر دریا کی سیر کو گروہ در گروہ جاتے ہیں اور وہاں کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے ہیں - کہیں جو دریا میں جزیرہ سا آجاتا ہے تو وہاں ہجوم ہو جاتا ہے - یہاں یہ رنگ میلوں کا ہے - مگر ہمارے ہندوستان کی طرح کے میلے اب یہاں ناپید ہیں *

لندن اتوار کو - یکشنبہ کا دن شہر میں عجب سناٹے کا ہوتا ہے - اتوار کو کام نہ کرنے کا جو مسئلہ عیسائی مذہب میں ہے - اگر اس کی پابندی ہندوستان میں کسی دن کے متعلق اس تشدد سے ممکن ہو تو اول میں تو لوگوں کو زندگی وبال معلوم ہونے لگے - جب عادی ہو جاویں - تو اور بات ہے - پوری ہڑتال ہوتی ہے - تمام دکانیں بند ہوتی ہیں اور بازار سنسان - کچھ لوگ باہر نکل جاتے ہیں - کچھ گھروں میں پڑے رہتے ہیں - کچھ گرجاؤں میں جاتے ہیں - مگر وہ چہل پہل سب بند ہوتے ہیں - کھانے پینے کے سامان عموماً ہفتہ کی رات کو اتوار کے لئے بھی ذخیرہ کر لیا جاتا ہے اور مسافروں کے لئے بھی ہوٹل وغیرہ اتوار ۶ بجے شام کے بعد کھلتے ہیں - نہایت بے رونقی ہوتی ہے - اور نئے آدمی کو شہر کا یہ رنگ دیکھ کر بہت تعجب ہوتا ہے - ڈاک بالکل بند ہوتی ہے - نہ کسی کو خط جا سکتا ہے نہ آسکتا ہے - اتوار کو لنڈن آرام کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے - اور ہفتہ بھر کا تھکا ماندہ اس آرام کا حقیقت میں مستحق بھی ہے - ہمیں بھی اس کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہئے - اب پھر کسی دن جب کاروبار رونق پر ہوگا تو سیر کو نکلینگے *

عبدالقادر

دربار غم

جو دسمبر سنہ ۱۹۰۲ء میں شائع ہوا تھا - اس کے مضامین بجائے ۶۰ کے ۹۰ صفحہ پر آئے تھے - انہیں بہت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا - اس کی کچھ زائد کاپیاں رکھی ہیں - جن حضرات کو شوق ہو جلد طلب فرمائیں - اس میں کئی نظمیں مستقل قدر کے قابل ہیں - قیمت ۶ر بذریعہ ترسیل ٹکٹ ہائے ڈاک یا وی - پی طلب کیجیے * مینیجر مخزن

بیوفائیِ احباب

(من کلام معجز نظام امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام)

دوستی اور برادرانہ اُلفت کا زمانہ نہ رہا۔ سچائی کم ہوگئی اور لوگوں سے امیدیں قطع ہوگئیں اور مجھے زمانہ نے اس آشنا کے حوالہ کر دیا جو بہت عہد شکن ہے اور کچھ بھی مروّت نہیں کرتا۔ وہی خدا مجھے بھی جلد بے پروا کر دیگا جس نے اوروں کو مجھ سے بے پروا کر دیا۔ کیونکہ ہمیشہ نہ امیری رہتی ہے نہ فقیری۔ نعمت رہتی ہے اور نہ راحت۔ اسی طرح مصیبت ہے کہ وہ بھی گذر جاتی ہے۔ جو دوستی اور محبت خدا کے لئے ہے وہ پاک و پاکیزہ ہے۔ برائیوں سے دل میں میل آجاتا ہے۔ جب میں کسی دوست کی بیوفائی دیکھتا ہوں تو اپنی اولوالعزمی اور حیا کی وجہ سے چشم پوشی کرتا ہوں۔ ہر زخم کے لئے ایک دوا ہے مگر بدخلقی کی کوئی دوا نہیں۔ اکثر بھائیوں سے میں نے محبت کی مگر اُن کی اُلفت میں قیام نہ پایا۔ منہ پر تو ہمیشہ محبت اور اخلاص کی باتیں ہیں اور جب تک ملاقات و بے پروائی ہے دوستی بھی ہے۔ مگر جہاں کوئی بلا نازل ہوئی اُسوقت وہ دشمن ہیں۔ اگر میں کسی کی نگاہ سے غائب ہو جاؤں تو اُسے کچھ بھی ملال نہ ہوگا بلکہ پیٹھ پیچھے دل کھول کر بُرا کہیگا۔ جب سردارِ اہل بیت نے دُنیا سے رحلت کی تو اُس پر کیا کیا ستم نہ ہوئے۔ دوستی کی مثال آج کے جانے والے مسافر کی ہے جس طرح یہ نہیں اُس طرح وہ بھی نہیں۔ آدمی مکر و فریب کے پُتلے ہیں۔ بظاہر تو بہت صفائی اور محبت سے ملتے ہیں مگر باطن میں اُنکے دل زہر میں بجھائے ہوئے ہیں۔ میرا علم میرا دوست ہے اور میرے اخلاق عمدہ ہیں۔ اگر میں ہزار دشمن تلاش کروں تو مجھے مل جائینگے اور ایک دوست چاہوں تو ڈھونڈھے نہ ملیگا۔ زمانہ کے سر پر خاک۔ اُس کے عہد میں بُرائی کے سوا سچائی نہیں۔ دُنیا میں

کوئی اپنا رفیق نہیں اور جو ہیں وہ سب ناموافق اور سچے نہیں ہیں۔

مَیں نے سفر کیا کہ جو کوئی ملے اُس سے پوچھوں کہ آیا دنیا میں کوئی سچّا دوست بھی ہے۔ لوگوں نے کہا۔ دو چیزیں نایاب ہیں کہ وُہ نہیں ملتیں۔ ایک دوستِ صادق۔ دوسرا بیضۂ انوق[1]۔ اَے بھائیوں والے۔ یہ زمانہ بھائی نہیں رکھتا۔ اُس کے سب بھائی ظالم ہیں جنکے دو دہن ہیں اور دو زبانیں۔ تجھ سے بظاہر کس خندہ پیشانی سے ملتے ہیں مگر دلوں میں بغض چھپائے رکھتے ہیں۔ اور جب تو اُن کی نظروں سے اُوجھل ہو جاتا ہے تو وُہ تیری غیبتیں کرتے ہیں اور جھوٹی جھوٹی تہمتیں دھرتے ہیں۔ اب یہ لوگ ہیں اور یہ زمانہ۔ کہ اس محبّت پر بھی تجھے دو آدمی دوست نہیں رکھتے۔ اَے شخص! تنہا رہا کر اور اپنے زمانہ میں کسی سے اُنس و محبّت نہ کر *

سجّاد ۔ عظیم آبادی

حبیب و ضامن

آج ہم ایسی دو تصویریں ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں جن کے دیکھنے کا اشتیاق ناظرین کو عرصہ دراز سے ہو گا۔ جناب حبیب کنتوری امام الشعرا شیخ امام بخش ناسخ علیہ الرحمۃ کی یادگار اور قادر الکلام و کہنہ مشق اُستادِ فن ہیں۔ انکے دیوان کے دیکھنے سے ثابت ہوتا ہے کہ غزل میں طرزِ قدیم و جدید کو کس خوبی سے اپنے اپنے موقع پر نباہ گئے ہیں۔ یہاں طرزِ جدید سے ہماری مراد مولانا حالی کا رنگِ غزل ہے اور اس رنگ میں جناب حبیب نے پاکیزہ غزلیں لکھی ہیں۔ جناب ضامن کنتوری حضرت حبیب کنتوری کے خلف ارشد اور ایک قابل شاعر ہیں۔ انکی کتاب ارمغانِ فرنگ اہلِ سخن سے دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ اور اُمید ہے کہ یہ اپنے والد ماجد کے فن کو قابلیت کے ساتھ

[1] وہ جانور جو پہاڑ پر انڈے سیتا ہے ۱۲

"برسات اور باغ و بہار"

وہ مزے وصل کے وہ مینہ کا برسنا رم جھم
اُف رے برسات کی رُت ہائے ری برسات کی رات

رات ہو اور برسات کی رات۔ ہر طرف سے "رم جھم۔ جھما جھم" کی ہی خوشگوار آواز سُنائی دیتی ہے۔ بادل کی گرج۔ بجلی کی چمک ہوا کی تیزی گھٹا ٹوپ اندھیاری اور اُس پر پانی کا "رم جھم" برسنا۔ نلوں سے زوروں پر پانی نکلتے ہوئے "بم بم" اور "ہا ہا" کی آواز۔ ہوا کا طوفان بے تمیزی کے ساتھ۔ پانی کی بوچھار لئے ہوئے۔ اُسارے کیا دالانوں میں بلا تکلف گھس آنا۔ اور ڈرنیوالوں کے نازک دلوں کو پریشان سا کر دینا۔ یہ ساری باتیں کچھ عجب بہار اور عجب لطف دے رہی ہیں۔

خوش نصیب۔ نامرادوں کی مراد بر آنے کا اچھا موقع ہاتھ آیا۔ بادل گرجا۔ نازک مزاج سہمے۔ دُور بیٹھنے والے قریب ہو گئے۔ بجلی چمکی اور گلے سے لپٹ گئے۔ تُند ہوا کے تیز جھوکوں اور پانی کی بوچھاڑ نے پردے چھوڑ دینے پر مجبور کیا۔ آرزومندوں کی تمنائیں پوری ہوئیں۔ بادۂ محبت کے متوالے جام وصال پی کر اور بھی مست و مخمور ہو چلے۔

مگر آہ اس ناکام کا حال نہ پوچھو جو مہجوری کے صدمے جھیل رہا ہو۔ برسات ہو۔ یا ابر و باد باغ و بہار ہو یا سُنسان جنگل یا تنگ و تاریک مکان۔ فراقِ یار میں۔ اور اپنی ناکامی پر۔ خون رونیوالی آنکھوں سے۔ اُسے سب یکساں نظر آتا ہے۔

جب وحشت میں صحرا نوردی کرتے ہوئے کہیں سبزہ زار و گلستان کی طرف نکل آتا ہے یا تو کچھ دیر جی بہل گیا۔ یا دلِ غمگین اور بھی اندوہگین ہو گیا۔ کبھی تو گل و گلزار کو دیکھ کر پھول سے رخسار یاد کر کے اور اُسے عارضِ جاناں سے تشبیہ دیکر آنکھوں سے لگاتا۔

اور برگِ گل کو لبِ لعل سمجھ کر اُس کے بوسے لیتا ہے۔ اور کبھی لالہ و گل کو دیکھ کر آنکھوں سے خون بہانے لگتا اور تاسف و حسرت کے دریا میں غوطہ زن ہو جاتا ہے۔

آہ! جس وقت آسمان ابر کی چادر سے قبا پوش نظر آتا ہے۔ جب پانی برستا ہوا ہوتا ہے۔ جس گھڑی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلتی ہوتی ہے۔ اور "جھم جھم" کی صدا کانوں میں آتی ہے۔ اُس وقت مفارقت کیسا کچھ ستاتی۔ اور جدائی دل دکھاتی ہے۔ آسمان دل پر ہر طرف سے درد و غم کی گھٹا چھا گئی۔ اور رنج و محن کی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ ادھر گنگا ادھر جمنا موجزن ہوئیں۔ اشک اُمڈے۔ آنکھیں برس گئیں اور وصلِ یار کا خوشنما منظر دیکھنے کو ترس گئیں ؎

اشک اُمڈے برس گئیں آنکھیں　　دیکھنے کو ترس گئیں آنکھیں

بادِ صبا کی طرح ٹھنڈی سانس چلنے لگی۔ دیدارِ یار اور وصالِ دلدار کی لذتیں حاصل کرنے کی بہتیری آرزوئیں خاک میں مل گئیں۔ ہائے۔ کن کن تمناؤں کا خون ہو گیا۔ آہ و زاری ہے اور بے قراری سی بے قراری!

اُف۔ یہاں سے جی گھبرا گیا۔ آیئے آپ کو اچھی اچھی جگہوں کی سیر کرا لائیں!

دِن چڑھ گیا ہے۔ پانی "جھم جھم" برس رہا ہے۔ سرد ہوا بہہ رہی ہے۔ سونے والے اپنی اپنی حویلیوں میں مُسہریوں پر چادر تانے راحت سے سوئے۔ اینڈ اینڈ کر میٹھی نیند کے مزے لے رہے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے نیند ٹوٹ بھی گئی تو ہوا کے خوشگوار جھونکوں نے پھر تھپکی دیکر سُلا دیا۔

اسوقت بیچارے غریبوں کی جھونپڑیوں کا کیا حال ہے؟ پانی جب زیادہ برسنے لگتا ہے تو۔ جورو خصم اور دو تین چھوٹے چھوٹے بچے کچھ پھٹے پُرانے کپڑے اوڑھے گوشوں میں سٹک کر بیٹھ جاتی ہیں۔ چُھونس کی چھپّر جا بجا ٹپک کر۔ دو چار۔ پانچ دس قطرے ابرِ رحمت کے اُنپر بھی ٹپکا جاتی ہے۔

پانی کم ہوتے ہوئے بچے ماں کی گود سے اُچھل کر پانی میں کودنے لگتے ہیں۔ کبھی جھونپڑے سے باہر۔ سامنے والے گڑھے کی طرف بڑھتے ہیں۔ ماں منع کرتی ہے۔ بُلاتی ہے۔ یہ نہیں مانتے۔ آخر پکڑ لاتی ہے۔

غرض اسی طرح پروردگارِ عالم ان مسکینوں کی بھی کاٹ دیتا ہے۔ ہ

امیروں کو مبارک ہو حویلی   غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی

آئیے ناظرین! آپ کو ایک نرالی جگہ کی سیر کرائیں۔

شام کا سہانا وقت ہے۔ کم کم پانی۔ ذرا تھم تھم کر۔ برس رہا ہے۔ جھولے لگے ہوئے ہیں۔ سرمستانِ شباب اور جنکے دلوں میں جوانی کے امنگ وولولے جوش زن ہیں۔ آب وتاب اور اہتمام وشان سے جھولے جھول رہے ہیں۔ مہین اور سریلی دل خوش کن آواز سے حسب حال وحسب خیال گیت اور ٹھمریاں گائی جارہی ہیں ہ

اے موسمِ برسات ذرا تھم کے برسنا   آجائے میرا پی تو جھما جھم سے برسنا

وغیر ذالک۔ آپس میں دل لگی اور مذاق بھی ہوتا جاتا ہے۔

کہیں پانی کی رم جھم کے ساتھ ایک بار زور سے بادل کڑکا یا بجلی چمکی اور جھولنے والے سہم سہم کر مکان کے اندر گھس گئے۔ کسی کا دل دھڑکا اور ایک دوسرے سے لپٹ کر بھاگے۔ بھاگتے ہوئے کپڑے چھڑے اور چوڑیوں کی آواز پانی کی آواز سے مل کر کچھ عجب کیفیت پیدا کردیتی ہے۔ "رم جھم۔ چھم۔ چھُن چھُن۔ چھماچھم"۔

پانی تھمگیا ہے۔ اگرچہ بوندیاں ٹپکتی ہیں۔ کسی سبزہ زار یا چمن زار کی سیر کیجیے گا تو میرے ساتھ آئیے! اوہ! کیچڑ یا پانی کی کچھ پروا نہیں۔ آپ کے جوڑے قیمتی ہیں تو کیا ہوا۔ بغل میں داب لیجئے!

اوہو! یہ سامنے والا سبزہ زار کیسا ہرا بھرا لہلہاتا نظر آرہا ہے۔ جی لوٹ پوٹ ہوا جاتا ہے۔ سبحان اللہ! قدرت کی کیسی کیسی گلکاریاں ہیں بےشک! ہ

فَفِی کُلِّ شَیْءٍ لَهُ آیَةٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهُ وَاحِدٌ

آہاہا! یہ باغ بھی کیا ہی بہار کی جگہ ہے۔ گلاب کی پتیوں کی بھینی بھینی بُو دماغ کو تر و تازہ کر رہی ہے۔ خوشبو کی لپٹ سے دل و دماغ معطّر ہو رہا ہے۔ غنچوں کی مُسکراہٹ۔ گلوں کی شگفتگی سے دِل کی کلی کھلی جاتی ہے۔

خوشنما درختوں کی سبز پتّیاں قلب پر عجب اثر پیدا کر رہی ہیں۔ سچ ہے۔ ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورق دفتریست زمعرفتِ کردگار

نظرِ غور سے دیکھئے تو اس گلزار میں کسی معشوقِ طنّاز کا پُورا جلوہ نظر آ رہا ہے۔ صنوبر و شمشاد کسی سرو قد کے قامتِ رعنا کی مثال ہونے کے باعث نہال ہیں اور اُس مسرّت سے بار بار جُھومنے لگتے ہیں:۔ لالہ وارغواں کسی گلعذار کے عارض گلگوں کی ادنیٰ شبیہہ ہونے کی بدولت باغ باغ ہیں۔ پھُولے نہیں سماتے:۔ نرگس کسی زہرہ شمائل کی جادو بھری نگاہ اور رسیلی آنکھوں کی بیمار ہے۔ یا یُوں کہو کہ کسی آہو چشم کے اشتیاقِ دیدار میں آنکھیں پھاڑے در کی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہے۔ سنبل کسی عمر دراز گل پُر پیچ سے پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ غُنچہ نسترن کسی گل رو کے دندان سلکِ گہر پر نثار ہے۔ ریحاں کسی ہندو کے خطِ جانستاں سے شرمسار ہو۔ برگ گل کسی لعل لب کے لبِ خوش گو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ خار کسی قاتل کے تیغ مژگاں سے خار کھا رہا ہے۔ سوسن کسی حور شمائل حمیدہ خصائل کی وصف میں زبان درازیاں کر رہی ہے۔

بادِ صبا کبھی تو کسی گل اندام نازک خرام کی اٹھلاتے ہوئے چال کی نقل بنا کر عاشق کے پائمال دل کو ایک ٹھیس لگا جاتی ہے۔

کبھی کسی تُند مزاج۔ سرکش۔ بُتِ بے پیر کی طرح تیزی دکھا کر تمام درختوں کو جھنجھوڑ

دیتی ہے - برسے ہوئے پانی درختوں سے گرنے لگتے ہیں - اور محض تھوڑی دیر کے لیئے یہ زمین پر دوسرا آسمان ہنکر مینہہ برسانے لگتے ہیں اور "رم جھم" کی آواز دل پر ایک اور ہی کیفیت پیدا کر جاتی ہے -

"رم جھم جھما جھم جھم جھم" اے لو! کس زور شور سے پانی آگیا - اور ابھی دریا کی سیر باقی ہی ہے - بوندیں درختوں سے چھن چھن کر ہمارے تمام کپڑوں پر ٹپک رہی ہیں - اُف - کیسی ٹھنڈی ہوا ہے - چلو! گھر بھاگ چلو!!

محمد محسن میاں پھلواری (پٹنہ)

خاتون اس نام کا ایک ماہواری علمی رسالہ علیگڈھ سے نکلنا شروع ہوا ہے - اس کے ایڈیٹر ہمارے لائق دوست شیخ عبداللہ صاحب بی - اے وکیل ہیں - اس رسالے کا مقصد صرف ایک ہی یعنی فرقہ اناث میں ترویج تعلیم اور پڑھی لکھی مستورات میں علمی مذاق پیدا کرنا -

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ رسالہ ملک کی ایک واقعی ضرورت کو مدنظر رکھ کر جاری کیا گیا ہو - اس رسالہ کے دو نمبر ہماری نظر سے گذر چکے ہیں - گو دوسرے نمبر میں بہت کچھ اصلاح کر دی گئی ہی تاہم ابھی اصلاح اور ترقی کی بہت کچھ گنجایش نظر آتی ہے - اگر اس رسالہ پر کافی توجہ کی گئی اور عام ضرورت کا خیال کیا گیا تو کچھ عجب نہیں کہ یہ رسالہ چل نکلے - رسالہ کی لکھائی چھپائی عمدہ ہو - حجم ۴۸ صفحہ ہو - سالانہ قیمت ۱ے معہ محصول ڈاک - درخواست بنام شیخ عبداللہ صاحب بی - اے وکیل علیگڈھ ہو +

کشمیر درپن - یہ رسالہ الہ آباد سے ماہوار شائع ہوتا ہی - ہر قسم کے علمی اور اخلاقی مضامین درج ہوتے ہیں - اسکی ترتیب پنڈت تیج بہادر سپرو ایم - اے ال ال ڈی وکیل ہائی کورٹ کے لائق ہاتھوں میں ہو - اس سالے میں عام طور پر کشمیری پنڈت صاحبان کے متعلق ہی مضامین ہوتے ہیں لیکن عام دلچسپی کے مضامین بھی کبھی کبھی شایع ہو جاتے ہیں - کشمیر درپن کی زبان سلیس اور پاکیزہ ہوتی ہو - خریداری کے درخواست بنام پنڈت منوہر لعل صاحب زتشی دارا گنج الہ آباد ہونی چاہیے +

دوپٹّہ

جب کچھ عرصہ ہُوا مَیں نے ٹوپی پر ایک مختصر سا مضمون لکھا تو کئی حضرات نے اس کی داد دی اور فرمائش کی کہ اب کچھ پگڑی پر بھی رہے۔ اس ارشاد کی تعمیل کر دیگئی۔ اور "دستار" ہدیۂ ناظرین ہُوئی اب لے دیکے پاؤں کا جُوتہ رہگیا ہے یار لوگ اسے بھی نہیں چھوڑتے ایک مہربان دوست نے لکھ بھیجا ہے کہ اب لگے ہاتھوں جُوتے پر بھی لکھ ہی ڈالو۔ لیجئے اب اس کی بھی خیر نہیں۔ اگر دستار پر کچھ لکھتے وقت یہ معلوم ہوتا کہ ایسی ایسی فرمائشیں بھی ہونگی تو کاہیکو اس کشمکش میں پڑتے۔ اب تعمیلِ حکم ہو تو مشکل اور انکار کریں تو مشکل۔ اس کے سوا ایک دقّت اَور بھی ہے۔ مختلف فرمائشیں ہیں اور یہ طے کرنا مشکل ہے کہ مقدّم کونسی ہو اور مؤخّر کونسی۔ جہانتک ممکن ہوگا ارشاد کی تعمیل سے دریغ نہ ہوگا۔ جُوتا لکھ تو ہو رہیگا۔ مگر اس کی باری ابھی جلدی نہیں آسکتی۔ ابھی ٹوپی ہی کے سلسلے میں ٹوپی کے سر پہ دھرنے کی طرز اور دستار کے متعلق اس کے باندھنے کی وضع محتاج توضیح ہیں۔ پھر انگرکھے۔ کُرتے اور پاجامے اور کوٹ پتلون وغیرہ کا موازنہ باقی ہے۔ مگر ان سب سے پہلے ایک دوست کی رائے نہایت صائب معلوم ہوتی ہے کہ مردوں کے سر کے لباس کا ذکر تو آگیا مگر عورتوں کے سر کی زینت یعنے دوپٹے پر کچھ نہیں لکھا گیا۔ اور دوپٹے کا استحقاق سب سے بڑھ کر ہے کہ اسپر ایک مضمون لکھا جائے۔ اُس رائے کو پیش کرتے وقت ہمارے قابل دوست نے نہایت شدّ و مد سے حقوقِ نسواں پر زور دیا ہے۔ وُہ فرماتے ہیں "ہمارے ہندوستان کی خستہ حالی اور تباہی اسکی پستی اور زوال دُنیا کے اقوام میں اسکی بے حُرمتی اور بدقسمتی کا یہی تو سبب ہے کہ اس میں آبادی کا ایک نصف بالکل بیکار سمجھا جاتا ہے۔ مرد اپنے

غرور مردی میں یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ دُنیا انہی کے لئے پیدا کی گئی ہو اور جہاں خدا نے اور مخلوقات ان کی آسائش کے لئے پیدا کر رکھی ہے وہیں عورتیں بھی انکے آرام کا ایک حصّہ ہیں اور یہ بھول گئے ہیں کہ عورت اور مرد ملکر مکمّل انسان بنتا ہو۔ دونو کی ہستی ایک دوسرے کے لئے ضروری اور بنی نوعِ انسان کے قیام کے لئے لازم و ملزوم ہے۔ عورت بغیر مرد کے اور مرد بغیر عورت کے نامکمّل ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ ہر دم ہر لحظہ عورتوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے۔ اور کوئی ایسی فروگذاشت نہ کیجائے جن سے عورتوں کے حقوق میں کوئی کمی واقع ہو۔ جو قومیں عورتوں کا حق پہچانتی ہیں اور انکی تعلیم و تربیت ویسی ہی ضروری سمجھتی ہیں جیسی مردوں کی وُہ اس زمانے میں خوشحال اور اقبالمند ہیں اور جو قومیں اِس فرض سے غافل ہیں وُہ دن بدن نیچے جا رہی ہیں اور اگر وُہ اپنی غفلت سے بیدار نہ ہونگی تو ایک دن عنقریب آئیگا کہ وُہ پستی کے پست ترین گڑھے میں جا گرینگی جہاں سے پھر نکلنا نہیں ہوگا۔ کوئی جسم صحیح اور تندرست نہیں کہا جا سکتا۔ جب اس کے آدھے حصّے کو رعشہ یا فالج کا عارضہ ہو اور اگر عارضہ کا علاج نہ کیا جائے تو سارے کا مفلوج ہو جانا یقینی ہے۔ پس آپ اگر حقیقت میں ملک کی خدمت کیا چاہتے ہیں تو خفیف سی خفیف باتوں میں بھی برابر حقوقِ نسوان کا خیال رکھیں اور کبھی پلڑے کو ناواجب طور پر مردوں کی طرف جھکنے نہ دیں"۔ ان خیالات سے جو ہمارے دوست نے ظاہر کئے ہیں اکثر لوگ اتفاق کرینگے۔ لیکن ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اُنہوں نے بہت سی فصاحت بے ضرورت اس بات کے منوانے پر صرف کی ہے کہ دوپٹہ پر مضمون لکھا جائے۔ اسکا تو کہدینا ہی اس ہدایت کے مانے جانے کے لئے کافی تھا۔ ہمیں خود خیال آیا تھا کہ اب دوپٹہ کی باری ہے مگر تامل تھا تو یہ کہ ہمارے مُلک میں شاعرانہ رنگین مزاجی نے دوپٹے کے ساتھ عشق و محبت کے چونچلے اس قدر ملا دیئے ہیں کہ

بغیر ان میں کسی قدر اُلجھنے کے ایسے مضمون کا تکملہ نہیں ہو سکتا۔ کون نہیں جانتا کہ دوپٹہ اکثر کھسکتا رہتا ہے یا تو اس کے مزاج میں ایک جگہ قرار سے بیتاب واری نفرت ہے یا اوڑھنے والوں کی چلبلاہٹ نے اس میں تاثیر پیدا کر دی ہے۔ اور حسن یار کے شیدائیوں کو ایک ختم نہ ہونے والا مضمون دیدیا ہے۔ اِدھر آنچل سرکا اور اُدھر حیا جس کے سپرد خیالی پہرہ داری ہے بولی "حضور دوپٹہ سنبھال کے" کہیں دوپٹہ ہوا سے اُڑتا ہے اور عاشق مزاج خوشیاں مناتے ہیں کبھی ہوا سے پیشانی کے اُوپر جھکا دیتی ہے۔ فوراً مشتاق نگاہیں بے تاب ہوتی ہیں اور بادِ صبا سے التجا کرتی ہیں کہ چلے اور رُخ سے یہ نقاب اُڑا دے۔ بعض لوگ ہیں کہ نہ دوپٹے سے غرض رکھتے ہیں نہ دوپٹے والوں سے۔ دوپٹے کے رنگ پر مرتے ہیں۔ کبھی دھانی رنگ کے گیت گاتے ہیں اور کبھی موتیا کے کبھی پیازی پر فدا ہوتے ہیں اور کبھی چمپی اور سوسنی پر جان دیتے ہیں۔ بعض ہیں کہ پوشاک سے گذر کر صاحبِ پوشاک کی تعریف میں محو رہتے ہیں انکے نزدیک دوپٹہ ملگجا سا ہو تو اور بھی لطف ہے مثلاً ایک صاحب لکھتے ہیں :-

اگرمی کا ہے گماں شک ہے ملاگیری کا
رنگ لایا ہے دوپٹہ تیرا میلا ہو کر

سچ پوچھئے تو اس شعر میں کسی قدر ایک فطری جذبے کا بیان ہے اگر کوئی نقش دل پر گہرا بیٹھ جائے تو پھر اس کے متعلق ظاہری چیزوں کی حالت کی پروا نہیں رہتی۔ میلا رنگ بھی میلا نظر نہیں آتا۔ کیونکہ کسی کے صاف رنگ کا پرتو اس میلے دوپٹے پر پڑ رہا ہے۔ مگر یہ تو سب رنگین لوگوں کی باتیں تھیں۔ ایسے زمانے میں جب انہیں فارغ البالی حاصل تھی کام کاج نام کو نہ تھا۔ "بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے" کا نقشہ تھا۔ آجکل کے عملی زمانے میں تصور کا کیا کام۔ ہمیں تو دوپٹے کو ہندوستان کی عملی

ضروریات کے لحاظ سے دیکھنا ہے۔ اس ملک کی آب و ہوا کے خیال سے یہ کہا جا سکتا ہے۔ زنانہ سر کے لئے خاصہ موزون لباس انتخاب ہوا ہے۔ گرمی ہوئی تو ہلکا سا کپڑا لے لیا۔ جاڑے آئے تو مرینے۔ پشمینے یا پھلکاری کی نوبت آگئی۔ مردوں سے علیحدہ بیٹھے تو اتار کے رکھدیا کہ ذرا سر کو ہوا لگے۔ صاحب خانہ آئے تو اوڑھ لیا۔ لحاظ کا اظہار بھی ہو گیا اور سجاوٹ میں بھی اضافہ ہو گیا۔ میلا ہوا تو آسانی سے دھل گیا۔ اور سفید ہوا تو جس رنگ میں چاہا رنگ دیا۔ روزنی زیبائش ہو گئی اور کوڑیوں کے مول۔ ایک غریب ملک کے لئے جس کی عورتیں یا تو گھروں سے باہر حسبِ رواج نکلتی ہی نہیں یا انہیں نکلنے کی ضرورت کم ہے۔ اس کے موزون ہونے میں مشکل سے کلام ہو سکتا ہے۔ لیکن جو عورتیں باہر نکلنے والی ہیں۔ انکے لئے چنداں آرام دہ نہیں چلتے میں اس کا سنبھالنا خاصہ اچھا محنت کا کام ہے اور گلی کوچے میں جس عورت کا دوپٹہ غیر معمولی طور پر بار بار کھسکتا نظر آئے۔ اس کے بھدے پن پر یا چالاکی پر دلالت کرتا ہے۔

اکثر دیکھا جاتا ہے کہ میمیں ٹوپی پہنتی ہیں۔ اور کئی ہمارے اہل وطن ایسے ہونگے جو دل ہی دل میں چاہتے ہیں کہ کاش ہماری بیبیاں انکا سا پہراوا اختیار کریں۔ مگر یہ خواہش مناسب حالات نہیں یہ تو ظاہر ہے کہ جب سارا لباس بدل جائے تو ٹوپی کا موقع آئے اور سارے لباس کے بدلنے میں بیشمار دقتیں ہیں۔ لیکن ویسے ٹوپی کو ہی دیکھیں تو اس میں بہت مشکلات ہیں۔ یہاں ہم میموں کو دو قسم کی ٹوپیاں پہنے ہوئے دیکھتے ہیں ایک تو نسبتاً ہلکی بہت پھیلاؤ والی تنکوں کی ساخت کی جو اکثر بیشمار قدرتی یا مصنوعی پھولوں سے لدی ہوتی ہیں۔ یا باریک کریپ یا ریشمی ململ کے خوش رنگ پارچوں سے سجائی گئی ہوتی ہیں۔ یہ بیشک زیب و زینت کا باعث ہیں۔ مگر معلوم نہیں کتنے لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ انکے بنانے سنوارنے سر پر دھرنے اور سوئیوں سلائیوں سے بالوں میں اٹکانے پر کتنا وقت صرف ہوتا ہے پس ہمارے ملک کے حالات میں جب موسم گرما

کی شدت بسا اوقات سر کو ننگے رکھنے پر مجبور کرتی ہے اور ملک کا رواج مردوں کے آتے ہی لباس سر زیب سر کرنے کا مقاضی ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی ایسی چیز جس کا پہننا اور اُتارنا خاص وقت چاہتا ہے اختیار کیجا سکے۔ دُوسری قسم کی ٹوپی جو میں یہاں پہنتی ہیں اور جس کی انہیں زیادہ تر اسی ملک میں ضرورت پڑتی ہے ایک طرح کی معمولی مردانہ انگریزی چھجے دار ٹوپی ہے۔ وہ دُھوپ وغیرہ میں چلنے کے لئے مفید تو ہے۔ مگر انتہا درجہ کی بدزیب ہے۔ اور فطرت انسانی جو دلفریبی عورت کے ساتھ منسوب کرتی ہے۔ اس کے خلاف ہے۔ دیسی عیسائی عورتیں جو سایہ اور میموں کی طرح انگریزی جاکٹ پہننے لگی ہیں۔ اور بال بھی اکثر انہی کی طرح سنوارتی ہیں۔ سر کے لئے عموماً دوپٹے ہی کی پابند ہیں۔ اور انصاف تو یہ ہے کہ دوپٹہ اوڑھے ہُوئے بھلی معلوم ہوتی ہیں۔ ٹوپی انہیں شاید بدنما معلوم ہو۔ ہاں ان میں اور ہمارے ہاں کی عام مستورات کے مذاق میں دوپٹوں کے بارے میں بہت فرق ہے۔ یہ اکثر سفید دوپٹے اوڑھتی ہیں خواہ گرمی ہو خواہ سردی۔ کیونکہ سردی سے بچنے کے لئے انکے باقی کپڑے کافی ہوتے ہیں۔ برخلاف اس کے ہندو مسلمانوں کی عورتیں کرتیاں تو ہلکے کپڑوں کی بناتی ہیں اور اوپر ایک سیر کے بوجھ کی چادر اوڑھتی ہیں جو بہت زیبا نہیں ہوتی اور جس میں ہوا لگنے کا اور بیمار ہونے کا خطرہ باقی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ ہندوستانی مستورات بالعموم گاڑھے رنگ اور گوٹے کناری کی بہت شائق ہوتی ہیں۔ گو اس بارہ میں خود بخود زمانہ بہت کچھ اصلاح مذاق کی کر رہا ہے اور ہلکے ہوائی رنگ اور سادہ دوپٹے یا زیادہ سے زیادہ باریک دھنک کے کنارے یا گنگری یا ریشمی لیس والے زیادہ مقبول ہوتے جاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی بہت سے گھر ایسے ہیں جن میں ایک ایک چادر فدیائی کی ایسی ہے جس پر سو سو تولہ گوٹہ منڈھا گیا ہے اور جسکا اوڑھنا نوجوان لڑکیوں کے لئے وبالِ جان ہو جاتا ہے اور ان دنوں میں جب انہیں ہولکے گھوڑوں پر سوار ہونا چاہیے۔ وہ مکانوں کے صحنوں میں رینگتی ہُوئی اپنی بھاری

سی چادر کے دامن سنبھالتی ہوتی چلتی ہیں۔ دوپٹوں کا ذکر نامکمل رہیگا اگر ہم ساڑھی کو بھول جائیں جو بنگالہ میں بمبئی میں مدراس میں اور اودھ کے بعض حصوں میں اس کا بکثرت رواج ہے۔ یہ ایک بڑا دوپٹہ ہوتا ہے جس کا ایک حصہ کمر کے گرد لپیٹ کر بدن کو بھی ڈھانپ لیتا ہے اور جس کا دوسرا حصہ سر پر اوڑھا جاتا ہے۔ یہ عورتوں کے لئے نہایت موزوں اور خوشنما لباس ہے اور ریشم کی خوش رنگ کنارے دار ساڑھیاں اور بنارسی ململ کے حاشیہ دار دوپٹے جو ساڑھی کا کام دیسکیں عجب بہار دیتے ہیں۔ اگر سلیقے سے پہنے جائیں۔ یوں تو بہت سی قومیں ساڑھی پہنتی ہیں اور پہننا جانتی ہیں۔ مگر پارسی عورتوں نے اسے درجہ کمال تک پہنچا دیا ہے۔ خوشنما ساڑھیوں کی پُرلطف بہار اگر دیکھنے کا شوق ہو تو بمبئی تشریف لیجائیے اور شام کے وقت بینڈ سٹینڈ کی طرف نکل جائیے۔ وہاں جاکر انگریزی اور پارسی لباس کا مقابلہ کیجئے۔ پھر سوائے ساڑھی کے اور کوئی چیز نظر میں نہ جنچیگی۔ میمیں باوجود اپنے خوبصورت گون اور خوشنما بونٹ (زنانہ ٹوپی) کے انکے لباس پر رشک کرتی ہیں۔ ساڑھی گھر کے اندر پہننے کے لئے بھی آرام دہ لباس ہے اور باہر نکلنے کے لئے بھی۔ اور اسی لئے اگر اس کا رواج شمالی ہندوستان میں زیادہ عام ہوجائے تو اس سے دو نتیجے پیدا ہوں اول تو ہندوستان خاص کے موجودہ لباس میں جو چھوٹے چھوٹے نقص ہیں وہ چھپ جائیں۔ یا دُور ہو جائیں اور دوسرے تمام ہندوستان میں خواتین کا لباس قریب قریب ایک سا ہو جائے جس کے فواید محتاجِ بیان نہیں ٭

اکرام

میرا ساغر آسمان ہے

اَے شراب! بس میرے سامنے سے دُور ہو جا۔ کیونکہ تو دُنیاوی آلائش سے لتھڑی ہوئی ہے۔ اور میری رُوح تجھ سے بیزار ہے۔ تجھ سے کہیں زیادہ صاف اور چمکتی ہُوئی ایک شراب ہے۔ جس کا میں دلدادہ ہوں۔ اور وہ موسم بہار کی مستی ہے۔ میرا ساغر آسمان ہے۔ اور میری آنکھ محوِ مے کشی ہے۔ میرا دماغ اس کے پینے سے عالم بالا کی سیر کرتا ہے۔ اَے عیشکر آ۔ اور چل میں اور تو دونو سبز پہاڑیوں کی سیر کرینگے۔ اور وہاں آفتاب کی روشن شراب پینگے۔ یہاں تک کہ آفتاب کی شان و شوکت ہمارے سر میں سما جائے گی۔

اَے خدا! جو تمام عالم کا مالک ہے میری رُوح تیری طرف جا رہی ہے۔ یہاں ہماری زیست ایک خوفناک تفرقہ ہے اور بہت ہی گہری جدائی ہے۔ جو دُنیاوی خوفوں سے پُر ہے۔

جب رُوح نکل جاتی ہے تو ہم سر اُٹھا کر اُوپر کو دیکھتے ہیں۔ جیسے کہ کوئی ماں اپنے بچہ کو جو عقاب کی چنگل میں ہے دیکھتی ہے۔ اگر یہ دیوانہ پن نہیں ہے تو کیا ہے۔

اَے خدا! مجھے ان آفتوں سے بچا۔

(ترجمہ) بشیر احمد (از لندن)

تصویرِ محبّت

میرا ایک دلی دوست تھا۔ اُس نے ایک نازپرورہ حسین اور قابل نوجوان عورت سے شادی کی۔ اگرچہ خود اس نوجوان عورت کے پاس کچھ ایسی دولت نہ تھی۔ مگر جان نثار شوہر ایک باثروت شخص تھا۔ اور یہ دونو بڑے ناز و نعم میں رہتے تھے۔ ان دونو میاں بیوی کی طبیعتیں کچھ عجیب طبیعتیں تھیں۔ وہ عاشق مزاج اور کسی قدر متین تھا تو یہ ہمہ تن بہجت و مسرت۔ مَیں نے بارہا تجربہ کیا کہ اگر کسی مجمع میں اس کے حُسنِ گلوسوز کی تعریف ہوتی تو وُہ اس کی طرف ایسی پیار کی نگاہوں سے دیکھا کرتا کہ یہ بیچین ہو ہو جاتی۔ دونو ہاتھ میں ہاتھ دیئے نکلتے۔ تو عجب عالم نکلتا۔ ایک بلند بالا اور قوی تو دوسری نازک اور ہلکی پھلکی۔ شوہر اس محبت اور اُلفت سے اسکا بازو تھام کر چلا کرتا۔ کہ یہ ایک فخر کی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتی اور شرما جاتی۔ نئے نئے اُمنگوں بھرے شباب کے گلزارِ سراپا بہار میں جس شوق و ذوق سے یہ جوڑا گلگشت کیا کرتا تھا۔ ذرا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے۔

سُوءِ اتّفاق دیکھئے شادی کو ابھی چند ہی مہینے ہُوئے تھے۔ کہ ہمارے دوست پر اچانک ایسی آفتیں آئیں۔ کہ تمام مال و اسباب ہاتھ سے جاتا رہا۔ اور مفلسی تک نوبت پہنچی کچھ عرصے تک اُس نے اپنا حال کسی پر ظاہر نہ کیا۔ شکستہ دل اور افسردہ خاطر رہا کرتا۔ آخر زندگی وبالِ جان معلوم ہونے لگی۔ مگر واہ رے صبر! بیوی کے سامنے ہمیشہ شگفتہ خاطر رہنے کی کوشش کیا کرتا۔ اس خیال سے کہ کہیں اس کے نازک دل کو صدمہ نہ پہنچے۔ لیکن تابہ کے۔ محبت کی تیز نظر دل نے آخر بھانپ لیا۔ کہ کوئی بات ہو ضرور۔ وُہ اس کی بدلی ہُوئی حرکات۔ اور دبی ہوئی آہوں کو بغور دیکھا کرتی تھی اور اسکی مریضانہ صورت کو خوب سمجھتی تھی۔ اُس نے اپنی تمام ادائیں اس کوشش میں صرف کر ڈالیں۔

کہ کسی طرح یہ پھر خوش و خرم رہنے لگے۔ مگر کچھ ہُوا تو یہ ہُوا کہ ناسور غم اور بھی زیادہ بڑھنے لگا جتنی اُس کی ادائیں اُسے بھلی معلوم ہوتی تھیں۔ اُتنا ہی یہ خیال دکھ دیتا تھا کہ ہائے اسپر عنقریب بڑی آفت آنے والی ہے۔ یہ تبسم تھوڑے ہی دنوں میں کافور ہو جائیگا۔ یہ آنکھیں جو اب اسقدر دلربایانہ انداز کے ساتھ چمکتی ہیں بہت جلد بے نُور ہو جائینگی۔ یہ چلبلا دل جو اب اس پیارے سینے میں مزے سے حرکت کر رہا ہے کل ہی دُنیاوی رنج و غم کے نیچے دب کر رہ جائیگا۔

آخر ایک دن وہ میرے پاس آیا اور اپنی ساری سرگذشت ایک عجیب یاس کے ساتھ مجھ سے بیان کی۔ مَیں سُن چُکا تو پوچھا "تمہاری بی بی کو یہ سب حال معلوم ہے"؟ یہ سُنتے ہی وہ زار زار رونے لگا اور کہنے لگا "خدا کے واسطے اگر تمہیں میری بیکسی پر رحم آتا ہے تو میری بیوی سے اسکا ذکر نہ کرنا۔ یہ اُسی غریب کا تو خیال ہی جو مجھے دیوانہ بنائے ڈالتا ہے۔ مَیں نے کہا کیوں نہیں کہہ دیتے آخر کبھی نہ کبھی معلوم ہوگا ہی پھر اُسوقت یہ خبر شاید اَور بھی قہر لائے تمہارا کہنا کچھ اَور بات ہے۔ علاوہ اس کے تم سخت غلطی میں ہو کہ اُس کی غمخواری سے فائدہ اُٹھانے کا موقع ہاتھ سے دے رہے ہو اور نہ صرف یہ بلکہ رشتۂ اُلفت کو کمزور کر رہے ہو۔ اُسے جلد معلوم ہو جائیگا کہ کوئی شے چُپکے چُپکے تمہارے دل کو توڑ رہی ہے۔ سچی محبت کشیدگی کو برداشت نہیں کر سکتی۔ محبوب اگر اپنا رنج بھی عاشق سے چھپائے تو عاشق کو سخت صدمہ ہوتا ہے۔" اُس نے جواب میں کہا "میرے مہربان! کیونکر اُس سے کہوں کہ تیری ساری اُمیدیں خاک میں مل گئیں۔ ہائے کس طرح اُسے بتلاؤں کہ تیرا شوہر کنگال ہو گیا اور تجھے سارا عیش و نشاط چھوڑ کر غریبی اور گمنامی میں بسر کرنا ہوگا۔ ہائے میری زبان سے کیسے نکلیگا کہ مَیں نے تجھے اُس اوج سے کھینچ کر گرایا ہے جہاں تو ہر کسی کی آنکھوں کا سکھ اور کلیجے کی ٹھنڈک ہو کر رہا کرتی تھی۔ ہائے وُہ غریبی کیونکر برداشت کریگی وُہ تو ثروت و نعمت میں بڑے نازوں سے پلی ہے۔ اُسے بیکسی کی تاب کس طرح آئیگی وُہ تو ہر دلعزیز رہی ہے نہیں! نہیں! اُس کا دل ٹوٹ جائیگا وُہ جان دے دیگی!" مَیں نے دیکھا کہ اب یہ

بڑے جوش میں ہے۔ خاموش ہو رہا کہ اچھا ہی باتوں میں اس کے دل کا بخار کچھ نکل جائے۔ آخر جب اسکا جوش مدھم پڑا اور وہ چپ ہو گیا تو میں نے نہایت ملائمت کے ساتھ پھر اسی قصے کو چھیڑا اور سمجھایا کہ اسکا ذکر اپنی بیوی سے ضرور کرنا۔ اس نے بڑی افسردگی کے ساتھ سر ہلایا۔ پھر میں نے کہا کہ بھئی اب تم اپنا ٹھاٹھ بھی بدل ڈالو۔ کوئی افسوس کی بات نہیں ہے تمہارے بعض دوست ایسے ہیں کہ اس حالت میں بھی تمہیں ویسا ہی سمجھینگے جیسا پہلے سمجھتے تھے۔ اور پھر تمہیں تو اپنی پیاری بیوی کے ساتھ رہنا ہے۔ جھونپڑے میں بھی رہو گے تو محل کے لطف اٹھاؤ گے"۔ اس نے جواب میں کہا "میری جان سے زیادہ پیاری بی بی"! پھر میں نے کہا "میرے دوست! خوب طرح یقین کر لو کہ اس کا اثر تمہاری محبوبہ پر کچھ زیادہ نہیں پڑیگا۔ اُسے تمہاری خدمت کا اور زیادہ موقع ملیگا۔ وہ تمہیں خوب تسلی دیگی۔ عزیز! ہر عورت کے دل میں محبت کی ایک چنگاری ہوتی ہے جو اقبال کے روز روشن میں خاکستر میں چھپی رہتی ہے مگر ادبار کی شب تاریک میں نکلکر بھڑک اٹھتی ہے۔ کسیکو معلوم نہیں کہ میری بیوی بھی ایک فرشتۂ رحمت ہے۔ ہاں اُسوقت خبر ہوتی ہے جب وہ اس کے ساتھ دکھ درد سہتی ہے اور اُف نہیں کرتی"۔ میری نصیحت نے میرے دوست پر بڑا اثر کیا۔ وہ مجھ سے وعدہ کر کے رخصت ہوا۔ اُس کے چلے جانے کے بعد میں نے خیال کیا کہ تو نے اُسے صلاح دے تو دی اگر اُس بی بی کو صدمہ پہنچا اور اُس نے اپنے پُر فضا طریق زندگی کو چھوڑ کر ذلت و حقارت کے تاریک گڑھے میں گرنا گوارا نہ کیا تو کیا ہوگا! میں یہ خیال کر کے کانپنے لگا اور جب تک اگلے روز میرے دوست نے آکر مجھ سے امر واقعی کا اظہار نہ کیا میرا دل برابر دھڑکتا رہا۔ ملاقات کے سب سے پہلے میں نے یہی پوچھا "کہو دوست کیا حال رہا؟" اُس نے جواب میں کہا، "میری فرشتہ خصلت بیوی! وہ اپنا رنج و غم سب بھول گئی۔ اُس نے میری گردن میں بانہیں ڈال دیں اور کہا بس اتنی ہی بات تھی جس کے باعث اتنے مغموم تھے" مگر میری بھولی بھالی! اُسے معلوم نہیں کہ غریبی کی ناگوار فکر میں چھوٹی چھوٹی ضرورتیں

اور ذرا ذرا سی ذلتیں پیش آئینگی تو عجب حال ہوگا۔" پھر میں نے اُس سے کہا کہ ایک مشکل معاملہ تو بخیریت فیصل ہوگیا اب دنیا پر بھی ظاہر کر دو۔ خالی خولی تمکنت سے فائدہ جب گرہ میں چار پیسے ہی نہ ہوئے۔ اور پھر ٹیپ ٹاپ رکھی بھی تو قلعی کب تک نہ کھلیگی۔ بس مفلسی سے جھینپو نہیں مفلسی پھر چنداں ناگوار نہ ہوگی"۔ میرے دوست نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ وہ مغرور طبیعت نہ تھا اور اُس کی بیوی کا تو کچھ کہنا ہی نہیں۔ چند روز بعد وُہ شام کو مجھ سے ملا۔ معلوم ہوا کہ اُس نے اپنا گھر بیچ ڈالا اور شہر سے چند میل کے فاصلے پر دیہات میں ایک جھونپڑی لے لی۔ وُہ تمام دن اُسکا اسباب پہنچانے میں لگا تھا اور یہ اسباب کچھ زیادہ نہ تھا بہت تھوڑا اور وُہ بھی انتہا کا سادہ۔ اُس نے اپنا پہلا بیش بہا سامان سارا دے ڈالا مگر اپنی پیاری بی بی کی ستاری رکھ چھوڑی۔ اس سے جُدائی ممکن نہ تھی۔ یہ ان دونوں کے ایام محبت کی یادگار تھی۔ مَیں اُس حسن و عشق کے قصّے کو سُنکر مُسکرایا۔ پھر اُس نے مجھ سے کہا کہ اب مَیں اپنے نئے گھر کو جا رہا ہوُں۔ میری بیوی دِن بھر چیزیں درست کرنے میں مصروف رہی ہے"۔ میرا تعلق اس کُنبے سے اِس قدر بڑھ گیا تھا کہ مَیں نے ساتھ چلنے کی اجازت چاہی۔ اور ہم دونو چل کھڑے ہوُئے۔ وہ دِن بھر کی کلفتوں سے اتنا تھک گیا تھا کہ راستے میں اُس نے ایک بات نہیں کی۔ خاموش رنجیدہ صورت بنائے قدم بڑھائے چلا گیا۔ آخر اُس کے مُنہ سے یہ نکلا "میری غریب بی بی" مَیں نے پُوچھا کیوں اور کیا ہوا؟ جواب دیا "ہوا کیا! کیا یہ کچھ نہیں کہ وُہ غریب ایک ذلیل سی جھونپڑی میں مقیّد ہے اور اپنے ہاتھوں سے وہ کام کرتی ہے۔ جو کبھی اُس کے آگے نوکر کیا کرتے تھے؟ مَیں نے کہا ایں! تو کیا وُہ اس نئی حالت سے ناخوش ہے۔ "ناخوش"؟ اُس نے جواب میں کہا "وُہ تو ہمہ تن مسرّت و راحت ہے۔ اصل پُوچھئے تو وُہ پہلے سے بھی زیادہ خوش ہے۔ آہ! وُہ تو

سراپا محبت اور سراپا تشفی ہے۔" ماشاء اللہ واہ وا" میں پکار اُٹھا "یار! تم تو کہتے تھے کہ ہم غریب ہیں۔ تمہارے قبضے میں تو وُہ بے انتہا بیش بہا خزانہ ہے کہ شاید ہی کسی کے پاس ہو۔ پھر وُہ کہنے لگا۔ "مہربانِ من! اگر یہ پہلی ملاقات بخیریت گذر جائے تو مجھے غالباً پھر کچھ غم نہ ہوگا۔ آج وہ دن ہے کہ پہلے پہل وہ ایک اُدنے سی جھونپڑی میں آکر رہی ہے اور اُس کے کم حیثیت سامان کی درستی میں اُسکا دن بھر صرف ہوا ہے۔ آج اُسکو معلوم ہوا ہوگا کہ خانہ داری کی تکلیفیں کیسی ہوتی ہیں۔ آج اس کو خبر ہوئی ہوگی کہ اب ہم کو ایسے گھر میں رہنا ہوگا جس میں کوئی شوق کی چیز بلکہ کوئی آرام کی چیز نہیں۔ ہائے اب وُہ تھکی ہاری افسردہ خاطر بیٹھی ہوگی اور سوچ رہی ہوگی۔ کر دیکھئے آگے کیا ہوتا ہے۔" مجھے خود ایسا ہی خیال تھا اِس لئے اس خیال کی تردید نہیں کی اور چپ چاپ بڑھا چلا گیا۔

اب ہم سیدھی سڑک کو چھوڑ کر ایک تنگ سے راستے کو ہولئے۔ اس راستے پر لمبے لمبے گھنیرے درختوں کا سایہ تھا جن سے خاموشی و عزلت ٹپکی پڑتی تھی۔ کچھ دُور چل کر جھونپڑی دکھائی دینے لگی۔ صُورت میں اگرچہ نہایت سادہ تھی مگر ایک عجیب کیفیت چھائی تھی۔ ہری ہری انگور کی بیل نے ایک حصّے کو سبز سبز پتّوں سے ڈھانک رکھا تھا۔ کچھ درختوں کی شاخیں اس پر سایہ کئے تھیں اور دروازے کے آگے اور سامنے کے چمن میں متعدد گملے قرینے سے رکھے تھے۔ پھاٹک سے ایک تنگ سا راستہ چند سرسبز جھاڑیوں میں چکر کھاتا ہوا دروازے تک پہنچا تھا۔ جُوں ہی نزدیک پہنچے گانے بجانے کی آواز ہمارے کان میں پڑی۔ ٹھٹک کر سُننے لگے۔ آہ! مریم نہایت بھولے پن کی ادا سے اپنی ستاری پر ایک چھوٹا سا گیت گا رہی تھی۔ مَیں نے دیکھا کہ میرے دوست کا ہاتھ جسے مَیں اپنے ہاتھ میں لئے تھا کانپنے لگا۔ وُہ گانا سُننے کے لئے اور آگے بڑھا۔ قدم پڑتے ہی کنکریلی روش پر کچھ شور سا ہوا۔ فوراً ایک حسین چہرہ جھروکے سے جھانک کر

غائب ہوگیا۔ پھر پاؤں کی ایک نرم آہٹ سُنائی دی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ مریم ٹھم ٹھم کرتی ہمارے استقبال کو آرہی ہے۔ لباس سفید خوبصورت اور دیہاتی وضع کا تھا۔ پیارے پیارے بالوں میں پھول اٹکے تھے۔ رخساروں پر شگفتگی تھی اور سارا کا سارا چہرہ مسکراہٹوں کے باعث روشن تھا۔ مَیں نے ایسی دلربا صورت پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

"میرے پیارے جرجیس" اُس نے پکار کر کہا "تمہارے آنے سے مجھے کسقدر خوشی ہوئی! ایک مدّت سے مَیں تمہاری منتظر تھی۔ کئی مرتبہ دوڑ دوڑ کر پھاٹک تک گئی کہ دیکھوں چلے آتے ہیں کہ نہیں۔ دیکھو جھونپڑی کے پیچھے ایک خوبصورت درخت کے نیچے مَیں نے ایک میز لگایا ہے اور کچھ مزیدار چھوٹے چھوٹے پھل اُس پر چُنے ہیں۔ بالائی کیسی نفیس تیار ہوئی ہے (شوہر کے بازو میں بازو ڈال کر اور ایک مسرّت کے ساتھ اُس کے چہرے کی طرف دیکھ کر) اوہو ہم کیسے خوش نصیب ہیں۔"

ہمارے دوست سے ضبط نہ ہوسکا اُس نے جھٹ اپنی دلربا کو سینے سے لپٹا لیا اور خوب سا پیار کیا۔ بات اُس کے مُنہہ سے نہ نکلتی تھی۔ آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں اِس کے بعد میرے دوست نے بارہا مجھ سے کہا کہ اگرچہ اب ہم خوش و خرّم ہیں اور مزے کی زندگی بسر کرتے ہیں مگر اُس لمحے سے بڑھ کر مسرّت بخش کوئی لمحہ نہیں گزرا۔ جس وقت اِس گھر میں آتے ہی میری پیاری بی بی نے میرا نہایت محبت و اُلفت سے اِستقبال کیا تھا۔

(ترجمہ از اردنگ)

سیّد نذیر حسین

خود ضبطی

۱- انسان میں دو طرح کی طبیعتیں ہوتی ہیں ایک اعلیٰ اور دُوسری ادنیٰ۔ ایک جسمانی طبیعت ہے جو اُسے اس دُنیاء فانی اور اس کی لذتوں میں گھسیٹ کر لا ڈالتی ہو۔ دُوسری رُوحانی طبیعت ہے جو اُسے خواہشات نفسانی اور بدیوں سے دُور رکھتی ہو۔ اور عاقبت اور عالمِ جاودانی کا راستہ دکھاتی ہے۔ انسان کی زندگی کیا ہے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ میلانوں کے درمیان ایک کشمکش ہو۔ اور چونکہ ادنیٰ درجہ کے میلان اور خواہشیں زیادہ زور کرتی ہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے آپ کو قابو میں رکھیں۔ اگر ہم سُستی اور کاہلی کی طرف مائل ہوں تو ہمیں ہاتھ پاؤں ہلانے چاہئیں۔ اگر ہم پر خود غرضی طاری ہوتی ہے۔ تو ہمیں اُسے یکلخت چھوڑنا چاہئے۔ کیونکہ ہمیشہ خود غرضی میں محو رہنا کمینہ کام ہے۔ اگر ہماری طبیعت قابو سے باہر ہونا چاہتی ہو۔ تو ہمیں اُسے حتی المقدور روکنا چاہئے۔ اور اگر کوئی چھوٹی یا بڑی بُرائی ہم پر غالب آنا چاہتی ہو۔ ہمیں اپنی قوتِ ارادی سے اُس بدی پر غالب آنا چاہئے۔ کیونکہ اگر شروع ہی میں بدی کو نہ روکا جائیگا۔ تو ہم جلدی اُس کے بس میں ہو جائینگے۔ ہربرٹ سپنسر صاحب فرماتے ہیں۔ کہ عمدہ آدمی کی ایک کمال خوبی یہ ہو کہ اپنے فطری جذبات اور خواہشیں اس کے بس میں ہوں۔ تعلیم اور کم از کم اخلاقی تعلیم کا یہ کام ہے کہ انسان محرک نہ بنے اور ہر ایک خواہش کے ذریعہ جو باری باری اُس پر غالب آتی ہے جوش میں نہ آجائے۔ بلکہ اپنے تئیں قابو میں رکھے۔ اِدھر اُدھر لغزش نہ کھائے۔ اور جو کچھ اُس کے خیالات ملکہ اور ہر ایک امر پر غور و فکر کے ساتھ بحث کر کے فیصلہ کر دیں اُس کے مطابق عمل کرے قاعدہ ہے کہ انسان بُری خواہشوں کے بس میں رہتا ہو۔ اور انکو نفس کشی ہی کی

طاقت سے قابو میں رکھ سکتا ہے اور اسی طاقت کے ذریعہ اخلاقی اور حیوانی زندگی میں تمیز ہو سکتی ہے۔ اِنسان کا فرض ہو کہ اپنے پر نیک طور سے حکومت کرے یعنی اپنے آپکو نیکی کی طرف راغب کرے۔ اِنسان کو اس سے زیادہ اَور کوئی خوشی نہیں ہو سکتی۔ اپنے آپ پر چپکے چپکے فتح حاصل کرنے سے اصلی عظمت حاصل ہوتی ہو۔ حضرت سلیمان علیہ السّلام کا قول ہو کہ جو شخص اپنی طبیعت پر حکومت کرتا ہے وُہ اس سے بہتر ہے جو ایک شہر کو تسخیر کرتا ہے +

اگر تم میں بدیاں ہیں جنکا استیصال کرنا لازم ہے۔ یا جذبات ہیں جن کا قابو میں رکھنا ضروری ہے۔ عقل کو اپنا آقا بناؤ اور اپنے جسم پر اپنی رُوح سے حکومت کرو۔

برابر لڑتے رہو اور جہانتک ہو سکے اپنی تمام طاقت سے مقابلہ کرو۔ گو لڑائی میں تمہارے خون کیوں نہ نکل آئے۔ تم گناہ کے لشکر کو گونگے مویشیوں کی طرح مغلوب کر لوگے۔ کیونکہ ہمّت اور ارادہ کے ساتھ سب کچھ ہو سکتا ہے +

بہر کارے کہ ہمّت بستہ گردد
اگر خارے بُود گُلدستہ گردد

۲۔ اپنے آپ پر قابو پانے سے ایک قسم کی جُرأت پیدا ہوتی ہے جو تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ سمائل صاحب فرماتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنے جذبات اور نفسانی خواہشوں کی باگوں کو ڈھیلا چھوڑ دے تو اس کی اخلاقی آزادی اسی وقت سے جاتی رہتی ہو۔ جس طرف زندگی یا دُنیا اُسے لئے جاتی ہے۔ اُس طرف وہ بہا چلا جاتا ہے اور جس موقع پر جو خواہش سب سے زیادہ غالب ہوتی ہے اُسی کا مطیع بنجاتا ہے۔ بہت سی بڑی خواہشیں ہیں جو سوسائٹی کو ذلیل کرتی ہیں۔ اور جب لوگ ان خواہشوں میں مُبتلا ہوتے ہیں تو ان کا

نتیجہ وُہ جرائم ہیں جن سے سوسائٹی ذلیل ہوجاتی ہے۔ لیکن جب لوگ عزت اور نفس کشی میں ترقی کرتے ہیں تو یہ خواہشیں بالکل نہیں رہتیں۔ ان نیکیوں کا بغور استعمال کرنے سے دِل اور طبیعت کی صفائی اور پاکیزگی مستمرہ ہوجاتی ہیں اور چال چلن میں پاکدامنی نیکی اور اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ چال چلن کی عمدگی عادت پر موقوف ہے اور اگر قوتِ ارادت نیک اور حق کاموں کی طرف رجوع کیجائے تو عادت ہمیں مہربان حاکم معلوم ہوگا اور اگر قوتِ ارادی بُرے اور ناحق کاموں کی طرف راجع کیجائے تو عادت ہمیں ظالم اور خودسر بادشاہ معلوم ہوگا۔ عادت ہمیں نیک راستہ پر چلنے میں مدد دے سکتی ہے۔ اور یہی عادت ہماری بربادی اور تباہی کا باعث ہوسکتی ہے۔ عادت کو احتیاط سے سدھانا اور تربیت دینا چاہیئے۔ اور تم یہ دیکھ کر حیران ہوجاؤ گے کہ انسان باقاعدہ تربیت اور ڈِرل سے بہت کچھ کرسکتا ہے۔ مثلاً فوج میں دیکھو۔ نہایت ہی ناکندہ تراش اور نکمے لوگ ہوتے ہیں۔ جیسے کہ گُستاخ اور وحشی لوگ جنکو گلی کوچوں میں سے پکڑ کر لے آتے ہیں۔ یا ناتجربہ کار اور ناشائستہ دیہات کے لڑکے ہوتے ہیں۔ جنکا کام ہل چلانا ہوتا ہے۔ لیکن عُمدہ ضبط اور قواعد کے ذریعہ ان سب میں ہمت جفاکشی اور نفس کشی کے اوصاف پیدا ہوجاتے ہیں جنکا گمان بھی نہ تھا۔ اور اگر انکو احتیاط سے تعلیم و تربیت دیجائے تو یہی لوگ لڑائی کے میدان میں یا اور مصیبت کے موقعوں پر اصلی بہادری اور شجاعت کی خاصیتیں ظاہر کرتے ہیں +

۳۔ اخلاقی ضبط اور قواعد عُمدہ خصلت کے پیدا کرنے میں بھی کم ممد و معاون نہیں ہیں۔ بغیر قوتِ ضبط کے کتابِ زندگی کا شیرازہ کُھل جاتا ہے +

سلف رسپکٹ یعنی خودداری کے خیال کی تربیت۔ فرمانبرداری کی عادت کی تعلیم۔ فرض کے خیال کی ترقی۔ یہ سب باتیں ضبط پر موقوف ہیں۔ جس شخص کو اپنے اوپر پُورا پُورا اطمینان بھروسہ ہوتا ہے اور جو اپنی طبیعت پر قادر ہے وُہ شخص ہر حالت میں اپنے

جذبات کا حاکم ہے - اور ہر شخص میں ضبط جسقدر زیادہ مکمل ہوگا - اسی قدر اس شخص کی اخلاقی حالت برتر ہوگی - اُسے اپنی خواہشوں کو سدھانا ہے - اور ان خواہشوں کو اپنی خاصیت کی اعلیٰ طاقتوں یا قوتوں کے بس میں رکھنا ہی - ان لوگوں کو اپنے اندرونی ہادی یعنی ضمیر کے حکم پر چلنا لازم ہے - ورنہ یہ اپنی نفسانی خواہشوں کے غلام ہونگے اور تحریک کے بس میں ہونگے ٭

۴ - اصلی شجاعانہ خصلت حلم اور قوتِ ضبط کے ذریعہ تکمیل کو پہنچتی ہے - واشنگٹن بالطبع پرجوش اور تند تھا - وہ جو اَور لوگوں سے نرمی ملائمت اور خوش خلقی سے پیش آتا تھا اور اُنکا لحاظ رکھتا تھا - اس کا باعث صرف اُس کی سخت نفس کشی کی عادت تھی - جس پر وُہ لڑکپن سے بڑی محنت سے کاربند رہتا تھا - اُس کی سوانح عمری لکھنے والا اسکی نسبت یہ بیان کرتا ہے کہ اُسکا مزاج پُرجوش تھا - اُس کے جذبات اور خواہشیں تیز تھیں - اور چونکہ بہت کچھ ترغیب اور تحریک دلانے والی باتوں سے کام پڑتا تھا وہ ہر دم اس امر کی کوشش کرتا تھا کہ اپنے مزاج پر قادر ہو اور اپنے جذبات کو بس میں رکھے اور آخرش وُہ اِنپر غالب آہی جاتا تھا - اور پھر یہ بھی لکھا ہی - کہ اُس کے جذبات تیز تھے اور بعض اوقات بڑی تیزی سے بھڑک اُٹھتے تھے - لیکن وہ ان کو لمحہ میں یعنی فوراً بس میں کرسکتا تھا ٭

ولیم خاموش کا یہ نام اس لئے نہیں ہوا کہ وُہ چُپ چاپ شخص تھا - کیونکہ جہاں کہیں فصاحت کی ضرورت ہوتی تھی وُہ نہایت فصیح اور عمدہ تقریر کرتا تھا - بلکہ یہ نام اُسکا اس لئے ہوا کہ جب کبھی بولنا حکمت میں داخل نہ تھا وُہ خاموش رہ سکتا تھا اور جب کبھی وُہ یہ دیکھتا کہ اُس کی نصیحت کا اظہار کرنے سے اُس کے مُلک کی آزادی کو نقصان پہنچتا ہے تو وُہ اپنی نصیحت اور صلاح کو باحتیاط تمام اپنے دل میں رہنے دیتا اور ظاہر نہ کرتا - اُس کا برتاؤ اس قدر حلیم اور صلح پسند تھا کہ اُس کے دشمن بھی اُسکو

بزدل اور مسکین مزاج کہتے تھے۔ لیکن جب لڑائی کا موقع آتا تھا تو اسکی ہمت شجاعانہ تھی اور اُسکا استقلال غیر مغلوب تھا۔

۵ - اپکٹیٹس کا بیان ہو۔ سقراط کے پاس جاؤ اور دیکھو کہ اُس نے ترغیب اور خواہشِ نفسانی کو کیسا پُورا پُورا بس میں کیا ہے۔ اور غور کرو کہ اُس نے اپنے پر جو دانستہ فتح حاصل کی وُہ کیسی عظیم ہے۔ یہ ایسی فتح ہے جو اکھاڑے میں ایک پہلوان دوسرے اپنے برابر کے پہلوان پر حاصل کرتا ہو۔ یہ ایسی فتح ہے جس سے ہم اُسے رستمِ ثانی سے تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ بخدا ہر شخص اُس کو یہ کہکر سلام کرے تو بالکل بجا ہو - اَے عجیب اور نمایاں فتح حاصل کرنے والے منصور تجھے مُبارک ہو۔ جس نے اپنی خواہشات نفسانی پر پُوری پُوری فتح حاصل کی۔ اور یہ بدنصیب اور کمبخت گھونسوں سے لڑنے والے اور پہلوان اور یہ کُشتی کرنے والے جوان سے مشابہ ہیں سلام کرنے یا تعظیم کے لائق نہیں ہیں۔ اور اگر تم خالی بکواس کرنے کے سوائے اس طرح اپنی طبیعت کو سدھانے کے عادی ہو جاؤ تو تمہیں معلوم ہوگا۔ تمہارے کیسے کندھے اور کیسے رگ پٹھے ہو جائینگے۔ وُہ ہی شخص اصلی پہلوان ہو جو اپنے پر آپ حکومت کرسکتا ہو۔

"شہنشاہ کا اوّل فرض یہ ہے کہ خود تعلیم و تربیت حاصل کرے اور پھر اپنی کچہری اور لشکر پر حکومت کرے۔ اوّل اپنے آپ کو لڑائی میں مغلوب کرے۔ اور پھر اپنے دشمنوں کو مارنے کے لئے کوچ کرے۔ کیونکہ کون شخص اَور آدمیوں کو مطیع کرسکتا ہے۔ جس نے اوّل اپنی اندریوں کو بس میں نہیں کیا" (مہابھارت)

م - ل

سمندر کا اِک اور نظّارہ

ہندوستان کے مغرب میں اسٹیمر کی رفتار کے مطابق بمبئی سے چھ۔ سات گھنٹے کے فاصلے پر شام کے ساڑھے چھ بجے کے قریب سمندر کے کنارے اک عظیم الشان پہاڑ کے دامن میں سیاہ پتھر کی چٹان پر گیروے کپڑے پہنے اک جوان شخص بیٹھا ہو۔ بار بار گردن پھرا پھرا کر گرد کے نظارے کا مشاہدہ کر رہا ہو۔ سوائے خدا کی ذات کے کوئی آس نہیں۔ توشہ نہ منزل کا بھروسہ۔ آگے ناتھ نہ پیچھے پگا۔ نے غمِ دزد نے غمِ کالا۔ بیٹھا ہو اور نچنت بیٹھا ہو۔

چادر چڑھائی چاکِ گریباں نے پھول سی
لاکھوں بناؤ دیگئیں یہ دھجیاں مجھے

اس کے دہنے ہاتھ میں ایک نوکدار ٹہنی یا شاخ ہو جسے گھس گھسا کر قلم کا کام لینے کو ٹھیک کیا ہو۔ پہلو میں ناریل کے خول یا چھلکے کا اک گہرا ٹکڑا ہو۔ جسمیں کسی پہاڑی درخت کی چھال کا رنگ بھرا ہوا ہو۔ زانو پر دبیز سے کاغذ کا اک میلا سا تختہ دھرا ہے جو خدا جانے کس طرح بے برگیوں میں اس کے پاس پڑا رہگیا۔ اِدھر اُدھر قدرت کی دلاویزیوں کو دیکھتے دیکھتے دفعتًا اِن سے وجدانیت کے عالم میں میر انیس مرحوم و مغفور کی یہ رباعی پڑھی :-

گلشن میں پھروں کہ سیرِ صحرا دیکھوں یا معدنِ کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر سو تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

اور بے تکلف اپنے مشاہدے کو لکھنا شروع کر دیا جسے لفظًا لفظًا ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

"یہ مقام جیسا ہر صبح شام نہایت ہی دلچسپ اور قدرتی صنّاعیوں پر مٹنے والوں کے لئے بے نظیر تفریح گاہ ہو۔ ویسا ہی ٹھیک دوپہر۔ اندھیری رات۔ اور جہاڑوں میں سخت مخدوش۔ ڈراونا اور اکیلے دکیلے چھوڑ دس بیس آدمیوں کے لئے بھی ایک جگہ ٹہتی رہنے پر روح فرسا ہے۔ جزیرہ جبستان یا نو آبانِ

حبشی نژاد کا پایۂ تخت اسی بھیانک مقام سے مراد ہے جو ساحل بحیرۂ عرب پر نہایت ہی وحشی مخلوق سے جگہ جگہ آباد ہے - میرا منہہ مشرق کی طرف ہے - اس لئے سامنے کی چٹانیں جھاڑیاں اور تری تک پہنچتے پہنچتے ریت کا دریا طے کر کے پھر جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے - چاروں طرف پانی ہی پانی دکھائی دیتا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ سامنے کے رُخ ہزارہا کوس تک کرۂ ارض کو نیل میں غوطہ دیدیا ہے - سوائے خدا کے اور کون جانتا ہے کہ اس سیّال پانی کے نیچے کوئی سیّال چیز کتنی بھری ہوئی ہے - اس کے گہراؤ میں کیا کیا ہے - کون کونسی مخلوق کیا کچھ کرتی ہے اور اسکی انتہا کہاں تک ہے - میں یہاں کی بابت کسی سے ضرور پوچھتا بشرطیکہ یہاں کوئی آدمی ہوتا - اکثر اوقات میں یہاں ٹہلا کرتا ہوں لیکن کبھی میں نے سوائے پولیس کے دو اک نیلی وردی والوں اور بعض بعض صرف لنگوٹی بند بھیلوں کے کسیکو ادھر آتے جاتے نہیں دیکھا - یا ہر روز قلعہ میں سے نکلتی ہوئی چند کشتیوں اور اپنے اپنے اوقات پر قلعے کے مقابل ادھر اُدھر سے آکر ٹھہرنے والے اسٹیمروں کو جنپر رجیوری اور نیس لکھا ہوا ہوتا ہے بیشک دیکھا کرتا ہوں - شاذ و نادر اگر کبھی کوئی غریب سپاہی یا قلعہ کا کوئی تلنگا قریب آ بھی نکلتا ہے اور اس سے میں کچھ پوچھ بیٹھتا ہوں تو خاک سمجھ میں نہیں آتا - کیونکہ وہ گجراتی یا کسی اور زبان میں کیچڑ پیتا ہے - اور میں اُردو میں چناں وچنیں کر کے خاموش ہو جاتا ہوں باقی جتنے اصلی باشندے یہاں کے ہیں وہ تو آدمی کی شکل دیکھ کر اس طرح بھاگتے ہیں جس طرح شیطان لاحول سے - میرے پس پُشت وہ نہایت ہی خوفناک درندوں سے بھرا ہوا خونخوار لٹیروں کا پُشت پناہ - آسمان سے باتیں کرنیوالے پہاڑوں کا نامتناہی سلسلہ ہے جو کہیں کہیں رُوح کی تیزی سے جلکر ملگجی ہو جانیوالی چھوٹی چھوٹی گھانس سے ڈھکا ہوا ہے اور کہیں بالکل کالی کلوٹی چٹانیں جہاں تنکے کا نام بھی نہیں اپنی قلعی کھولے دیتی ہیں - ہاں دامن میں بیشک صدہا ہرے بھرے مختلف قسم کے درخت ہیں جنمیں اکثر کے میں نام بھی نہیں جانتا اور نہ میں نے کبھی دیکھے بلکہ اگر مبالغہ نہ سمجھا جائے تو میں کہہ سکتا ہوں نہ یہاں سے سمندر کے کنارے تک چاروں طرف خشکی کا تمام ریتلا حصّہ - بادام - ناریل - چھالیا - ناڑ - شریفے - انجیر - خودرو بیلوں - بیریوں اور مختلف جھاڑی بوٹیوں سے پٹا پڑا ہے - یہ اپریل کا آخری

حصّہ ہو اور دوپہر کے سکون کے بعد شام ہوتے ہی بحیرۂ عرب کا تمام پانی چونچال ہوتا چلا ہو۔ دہنی طرف ذرا فاصلے پر اِک اَور چھوٹا سا پہاڑ ہو جو عین سمندر میں قدم جمائے کھڑا ہے اور جس کے پیچھے جاکر دن بھر کا تھکا ماندہ آسمانی سیّاح بھی آرام لینے کو ہے۔ واللہ و باللہ گو اس سے پہلے بھی ڈوبتے سُورج اور لہریں مارتے ہُوئے نیلگوں سمندر کی چھب تختی اکثر تصویر کے پردے میں دیکھی جا چکی ہو۔ مگر نہیں نقل کو اصل سے کیا نسبت؟ بلکہ جتنا جتنا غور کرتا ہُوں میری یاددشت کی سب تصویریں موجُودہ نظارے کے سامنے نقش بر آب ہیں۔ اللہ اللہ جُھٹ پٹا ہوتے ہی پانی کی سیاہی مائل چادر کو یُونہی کا یُونہی بچھا ہوا چھوڑ کر ذرا اُوپر تو دیکھئے۔ رنگا رنگ بادلوں کے ٹکڑے نیچے اُترتے اُترتے حدِ نگاہ تک جاکر کس پیار سے بحیرۂ عرب کے دُوسرے بازو سے جا لپٹے ہیں۔ کہ مجھے بے اختیار وہ ارمان بھری آغوش کا ایک دُوسرے سے وابستہ ہو جانا یاد آگیا۔ غصیلے سمندر کا زہر ہلاہل پانی دُھر اُدھر سے شور مچاتا ہوا آتا ہے اور کچھ فاصلے کو موج در موج طے کر کے مُنہ سے کف ڈالتا ہوا پھر پلٹ جاتا ہو۔ بائیں طرف مختصر سا شاہی قلعہ ہو جسے جنجیرہ کہتے ہیں لیکن نشان کے پھریرے کا ہوا میں نہ لہرانا صاف بتا رہا ہو کہ رئیس آجکل یہاں نہیں ہو۔ آہا ہا شفق پھُولنی شروع ہُوئی۔ سمندر کا مکھڑا ابھی ہلکا ہلکا گلابی ہو چلا۔ نہیں نہیں گلاب کے پھُول جگہ جگہ تیرنے لگے۔ اب جُوں جُوں رات زیادہ آئیگی وُوں وُوں ہوائیں تیز تیز چلینگی۔ موجیں گھڑی گھڑی بپھرینگی۔ قلعہ کی بلند دیواروں اور چٹانوں کی کنگروں پر منبڈھا اُچھلنے لگیگا۔ لو وُہ رات کی گہری سیاہی پہاڑوں پر سے اُتری۔ آگے بڑھی۔ پھیلتی چلی آج شاید آخری چاند اپنا جلوہ دکھائے تارے کھچ کھچ نکلیں اُنکا عکس پانی میں پڑے اور نقاشِ قدرت اس سائے سے دُوسرا باغ لگا دے۔ پھر پچھلا پہر ہوگا۔ پَو پھٹیگی۔ پرند چہچہانے لگینگے۔ ابابیلیں جھومر ڈالینگی۔ شبنم میں ڈُوبی ہُوئی ہوائیں چلینگی۔ بھونرے گونجتے نکلینگے۔ شہد کی مکھیاں اُڑینگی کلیاں کھلینگی۔ پہاڑی پھولوں کی بھینی بھینی لپٹیں آئینگی۔ سبزہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھیگا۔ ڈالیاں جھُومینگی اور رات بھر کے بھُس ہو کر پڑے ہوئے محنت کش اپنے اپنے کام سے لگ جائینگے ✤ (آغا شاعر دہلوی)

فنِ اشتہار

گو ہندوستان میں بھی آجکل بہت سے نمونے اشتہار دیکر فایدۂ کثیر اُٹھانیکے موجود ہیں۔ مگر اشتہار کی پوری قدر و قیمت کا صحیح اندازہ کرنے اور اُس کی قوت کی انتہا کو جانچنے کے لئے مغربی دُنیا کی سیر کی ضرورت ہی۔ جیسا کہ ہمارے مُلک میں ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہی جو اشتہار کو نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں اور اشتہار دینے والوں کو کسی قدر مذموم جانتے ہیں۔ اسی طرح یُورپ میں بھی کچھ لوگ ایسے باقی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ کسی معزز کارخانے کو اِشتہار کے ذریعے روپیہ نہیں کمانا چاہیے۔ فرق یہ ہی کہ ہمارے ہاں تو یہ خیال آبادی کے ہر طبقہ میں موجود ہی اور تجارت پیشہ لوگ بھی اس سے آزاد نہیں لیکن مغرب میں یہ رائے غیر تجارتی لوگوں میں باقی ہی۔ لیکن کاروباری دُنیا اشتہارات کی ضرورت کی پوری طرح قائل ہوگئی ہی۔ اور کوئی نامور سے نامور بڑے سے بڑا۔ مالدار سے مالدار کارخانہ ایسا مشکل سے ملسکتا ہی جو اشتہارات سے فائدہ نہ اُٹھاتا ہو۔ اور یہ ثابت ہوگیا ہی کہ کامیابی کی دوڑ میں جو تجارت اپنے کارنامے پُورے طور پر مشتہر نہیں کرتی وہ دنوں میں زوال پانے لگتی ہی اور جب واقفانِ راز سے مشورہ لیتی ہی تو وہ اس کے درد کا درمان اشتہار ہی بتاتے ہیں۔ اِسی سبب سے اب انگلستان بھی بمقابلہ امریکہ کے بہت قدامت پرست مُلک ہی اور عموماً پُرانے خیالات کے چھوڑنے پر مائل نہیں ہوتا بعض پُرانی پُرانی اور دیر سے جمی ہُوئی کمپنیاں بھی اشتہارات کی طرف رجوع لائی ہیں اور اُنہوں نے لاکھوں روپے صرف کرکے یہ نوبت پہنچائی ہی۔ کہ آدمی کہیں جائے اُن کے اشتہارات سے چھٹکارا مشکل ہی بس گاڑی پر سوار ہو تو وہ موجود۔ ٹرام پر چڑھو تو وہ حاضر۔ ریل میں بیٹھو تو سٹیشن کی دیوار اُن سے پُر ہی۔ گاڑی میں بیٹھو اُنکی زیارت ہوتی جاتی ہی اور اُتر کر زینے چڑھنے لگو تو ایک ایک سیڑھی پر نمایاں حروف میں کسی نہ کسی چیز کا اشتہار پاؤ گے۔ اشتہارات کی طرف اس عام رجوع کا نتیجہ یہ ہوا ہی کہ اشتہار لکھنے۔ اسکی ترکیب سوچنے۔ اسکی تصاویر بنانے۔ اسکے چھاپنے اور اسکے تقسیم کرنے کا

ایک خاص صیغہ قائم ہوگیا ہو اور لندن کے بازاروں میں چلتے ہوئے جا بجا لکھا ہوا نظر آتا ہو۔ اشتہارات کی ایجنسی۔ یہاں تمام دُنیا کے اخبارات کے لیے اشتہار لئے جاتے ہیں"۔ کہیں لکھا ہوتا ہو "ٹھیکہ دارانِ اشتہار"۔ ان دوکانوں کے مالک وُہ لوگ ہیں جو اس صیغے سے خاص واقفیت رکھتے ہیں۔ وُہ مختلف جنسوں کے بیچنے والوں کو یہ بتا سکتے ہیں۔ کہ کونسا ذریعہ اُن کے لئے زیادہ مفید ہوگا کسی کو کہتے ہیں کہ آپ کے لئے اخبارات میں اشتہار دینا بہتر ہو۔ کسی کو مشورہ دیتے ہیں کہ ماہوار رسالے آپ کے لئے مفید ہونگے۔ کسی کو رائے دیتے ہیں کہ ریل کے سٹیشنوں پر اور مختلف گاڑیوں پر آپکے اشتہار کا موجود رہنا اچھا ہو۔ کسی کو نمائش میں بڑے بڑے کاغذ چسپان کرانیکی صلاح دیتے ہیں اور کسی کو کہتے ہیں کہ ان سب ذریعوں سے کام لے اور ایک دفعہ پانی کی طرح زر بہادے۔ پھر دیکھے کتنا فائدہ ہوتا ہو۔ انہیں ہر ذریعہ اشتہار کے نرخ معلوم رہتے ہیں۔ اور مختلف اخباروں اور رسالوں کی اشاعت کا حال بھی دریافت کرتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح یہ لوگ مشورہ دے سکتے ہیں کہ کون کون سے اخبار اور رسالے کارآمد ہونگے۔ یا کس جنس کے لئے کونسا پرچہ اچھا رہیگا۔ ہر ایسے کارخانے میں دو تین آدمی ایسے ہوتے ہیں۔ جو اشتہارات کا مضمون لکھنے یا انکی ترکیب سمجھانے میں مہارت رکھتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اس ترکیب کو بطور ایک فن کے سیکھتے ہیں۔ اور جب اُس میں ماہر گنے جاتے ہیں تو نہایت معقول تنخواہیں پاتے ہیں۔ کئی کارخانے ایک ایک ایسا ماہر خاص اپنے ہاں نوکر رکھ لیتے ہیں۔ جسکا کام اُنکے اشتہار کے لئے مختلف تدبیریں سوچتے رہنا ہوتا ہو اور جو دوسرے کسی کارخانہ سے سروکار نہیں رکھتا۔ ہمارے ملک میں شاید اس امر پر تعجب ہوگا۔ کہ اشتہار لکھنا اور فن! اور بہت حضرات کہینگے کہ اس میں کون سی کرامات درکار ہو۔ ذرا سی مشقِ انشا اور قوتِ مبالغہ درکار ہو۔ اپنی چیز کی بڑھ چڑھ کر تعریف کی۔ اور اسکی خوبیوں کو آسمان پر چڑھا دیا۔ چلئے اشتہار ہوگیا۔ کوئی کوئی بیوقوف تو پھنس ہی جائیگا۔ ع چو احمق در جہاں باقی است کس مفلس نمے ماند۔ بیشک یہ تو احمقوں کے پھانسنے کی ترکیب ہوئی۔ دریافت طلب یہ امر ہو کہ داناؤں کے پھنسانیکا بھی کوئی ڈھنگ ہو یا نہیں اسکا جواب یہ ہو کہ ہاں ہو۔ اور اسے یورپ اور امریکا میں کمال کو پہنچایا گیا ہو۔ مگر اسکے سیکھنے کے لئے ویسی ہی مشق اور کوشش درکار ہو جیسی کسی اور فن کے لئے۔ اگر کوئی سیکھنا چاہو تو اُس کے سکھانیوالے موجود ہیں۔

باقاعدہ طور پر اُنکا شاگرد ہونا پڑتا ہے۔ ماہوار فیس یا معقول معاوضہ دینا پڑتا ہے۔ مُدّت تک دماغ سوزی ہوتی ہے۔ جب کہیں جاکر اُنکے معیار میں پُورا اُترتا ہے[۱۵]

کسی ماہرِ فن کی اشتہار نویسی اور ایک ناواقف مگر اچھے پڑھے لکھے آدمی کی اشتہار نویسی میں ایک بڑا فرق یہ ہوتا ہے۔ کہ ماہر جس بات کو چند لفظوں میں کہہ سکتا ہے۔ ناواقف کئی سطروں میں اُس خوبی سے نہیں کہہ سکتا۔ وُہ چند لفظ آسانی سے نظر میں کھُب جاتے ہیں۔ دُور سے رہگزر کی آنکھ بھی اُنپر پڑ سکتی ہے۔ اور دل پر بھی نسبتاً آسانی سے منقُوش ہوتے ہیں۔ ہمارے مُلک میں اکثر مشتہرین کی کوشش یہ ہوتی ہے۔ کہ جہانتک ہوسکے کاغذ زیادہ کالا کیا جائے۔ اخبار میں جگہ زیادہ مانگتے ہیں۔ پھر جتنی جگہ لیں اس میں مضمون زیادہ بھرنا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ گنجان تحریر ہو جاتی ہے اور اس قدر الابلا اُس میں بھری ہوتی ہے کہ سوائے بالکل بیکار آدمیوں کے بہت کم لوگ اشتہارات کو دیکھنے کی پروا کرتے ہیں۔ اِس غلطی کا باعث صرف اصُولِ اشتہار سے آگاہی کا نہ ہونا ہے۔ اشتہار چاہیے وُہ جس پر سرسری دیکھنے والے کی بھی نظر پڑے۔ اُس کا آغاز چاہیئے ایسے لفظ یا الفاظ سے جو باقی حصّے کے پڑھنے پر انسان کو مجبُور کردیں۔ اور باقی الفاظ ایسے چاہئیں جو آنکھوں کے راستے دل میں اُتر جائیں اور تیر کی طرح نشانے پر جا بیٹھیں۔ پڑھنے والے کے دل میں ایک بار تو اُمنگ پیدا ہوجائے کہ ہاں یہ سودا لینے کے لائق ہے۔ اور کچھ نہیں تو وُہ خط لکھ کر نمونہ ہی منگوائے۔ پھر اگر مال میں کوئی خوبی ہے تو گاہک خواہ مخواہ اپنا ہوگیا۔ یورپ میں تصویر سے اشتہارات میں بہت مدد لی جاتی ہے اور معقول بھی ہے۔ کیونکہ تصویر عام توجہ کے کھینچنے میں الفاظ سے زبردست آلہ ہے اور اگر دلکش یا تعجب خیز تصویر کے ساتھ چیدہ اور دلنشین الفاظ کی قوّت بھی شامل کردی جائے تو پھر دلوں کے قفلوں کی کُنجیاں آپکے ہاتھ میں ہیں کھولتے چلے جایئے۔

ہمارے ہاں اشتہار کو ایک زائد اور غیر ضروری خرچ سمجھا جاتا ہے۔ اور گو ایک دُوسرے کو دیکھ کر کئی

[۱۵] راقم کو چونکہ بوجہ اخباری دُنیا سے تعلق کے اشتہارات سے دلچسپی تھی۔ اِس لئے لنڈن پہنچتے ہی اس فن کے حالات دریافت کئے۔ اب ایک نامی مُعلّم سے تلمذ ہوگیا ہے۔ وُہ کہتے ہیں کہ باوجود ابتدائی مشق موجود ہونے کے ایک سال بھر کی کوشش کامیابی کے لئے درکار ہے۔ اپنی طرف سے پُوری سعی کیجائیگی۔ اور اگر خدا کو منظور ہُوا۔ تو اس تحصیل سے بعض اہلِ مُلک کو فائدہ پہنچیگا۔

اصحاب کثرت سے اشتہار دینے کا شوق کرنے لگے ہیں۔ مگر وہ اشتہار میں ہر طرح ارزانی کی جستجو میں رہتے ہیں۔ اگر اپنے طور پر علیحدہ چھپواتے ہیں تو ردی۔ کم قیمت۔ بدنما کاغذ پر۔ سستے چھاپہ خانے میں۔ ایک ایک صفحہ پر بیشمار سطریں۔ بے ضرورت اور بے ربط عبارت میں شائع کر دیتے ہیں۔ پھر کہتے ہیں دس ہزار اشتہار تقسیم کئے۔ مگر صدائے برنخاست صرف چند خطوط آئے اور تو کوئی بولا نہیں۔ اب اشتہار میں بھی کچھ نہیں رہ گیا" کوئی اُن سے یہ تو کہے کہ اشتہار میں تو سب کچھ ہے۔ آپ اپنے دماغ سے بھی کام لیں۔ دس ہزار پر جو لاگت آئی ہے۔ اُس لاگت سے ایک ہزار چھپوائیے۔ کاغذ ہو عُمدہ۔ لکھائی ہو نفیس۔ عبارت ہو دلچسپ۔ فقرے ہوں تھوڑے۔ کچھ۔ کچھ سجاوٹ بھی ہو۔ صاف چھپیں اور احتیاط سے تقسیم کرائے جاویں۔ اندھا دُھند نہیں۔ کہ چیز ہے عوام میں بکنے کی اور اشتہار تقسیم ہو رہے ہیں ایک ایسی اخبار میں جس کا بیشتر حصہ اُمرا کے ہاتھ میں جاتا ہے یا چیز ہے اُمرا کے کام کی اور اشتہار تقسیم ہو رہے ہیں کسی ایسے پرچے میں جس کے سب گاہک کم بضاعت یا متوسط الحال لوگ ہیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہے کہ کامیابی کے لئے جو مناسب ترکیبیں ہیں وہ تو عمل میں نہ لائی جاویں۔ مگر کامیابی کی توقع رکھی جائے اور جب وہ منہ نہ دکھائے تو شکایتیں ہوں

اسکے سوا بعض چیزوں کو چھوڑ کر جنکی فروخت ہر وقت ہو سکتی ہے کئی اشیا ایسی ہیں۔ جو خاص موسموں سے متعلق ہیں فرض کیجئے۔ کہ ایک شخص پشمینہ کا سوداگر ہے۔ اور تمام ہندوستان کے اخباروں میں سال بھر اشتہار دیتا رہتا ہے۔ اور جب گرما میں ایک آدھ گاہک بھی بمشکل ملتا ہے تو اخبارات اور اشتہارات سے ناراض ہونے لگتا ہے۔ حالانکہ وہ نصف کے قریب روپیہ بے جا مدوں میں بالکل ضائع کر رہا ہے یہی روپیہ اگر موسم کے موقع پر اشتہار کے اور طریقوں پر لگائے تو بحیثیت مجموعی زیادہ نفع حاصل ہو اور موسم کے دنوں میں اگر اُسکا اشتہار روز رنگ بدلتا ہے اور نئے سے نئے پیرایہ اور رنگا رنگ کی ترکیبوں میں نکلتا ہے تو زیادہ لوگ اسکی طرف کھنچیں۔ ہم نے کئی اشتہار اپنے اہل وطن کے دیکھے ہیں کہ ہر اخبار میں کئی سال سے ایک عبارت میں چھپ رہے ہیں۔ اور جو روپیہ اِس غفلت سے بے نتیجہ صرف ہو رہا ہے۔ اُس پر نہایت افسوس کرتے ہیں۔

یہ تو وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ جوں جوں مُلک میں تجارت ترقی کریگی اور مغربی تہذیب کا اثر بڑھیگا۔ اشتہارات کے متعلق جو تعصب ہے یہ تو کم ہوتا جائیگا اور وہ لوگ جو اب اشتہار نہ دینے پر فخر کرتے ہیں وہ بھی چار و ناچار اِس ذریعہ تجارت کے استعمال کرنے پر مجبور ہونگے۔ گویا یہ ایک نہ رکنے والا سیلاب ہے جو آ رہا ہے۔ کوشش ہونی چاہئے تو یہ کہ اشتہار دینے والے دروغ کو فروغ دینے کے الزام سے بری رہیں۔ اور اچھی اور فی الواقع کارآمد چیزوں سے عوام کو آگاہ کریں۔ اور اشتہارات دینے میں اصول و

بلالؓ

چمک اُٹھا جو ستارہ ترے مقدر کا — حبش سے تجھ کو اُٹھا کر حجاز میں لایا
ہوئی اسی سے ترے غمکدے کی آبادی — تری غلامی کے صدقے ہزار آزادی
وُہ آستاں نہ چھٹا تجھ سے ایکدم کے لئے — کسی کے شوق میں تُو نے مزے ستم کے لئے
جفا جو عشق میں ہوتی ہے وُہ جفا ہی نہیں — ستم نہ ہو تو محبت میں کچھ مزا ہی نہیں

ستم ہے شوق کی آتش کو مثلِ موجِ ہوا
"خدا بھلا کرے آزار دینے والوں کا"

نظر تھی مثلِ سلیماں[۱] ادا شناس تری — شرابِ دید سے بڑھتی تھی اور پیاس تری
تجھے نظارے کا مثلِ کلیم سودا تھا — اُویس[۲] طاقتِ دیدار کو ترستا تھا
مدینہ تیری نگاہوں کا نُور تھا گویا — ترے لئے تو یہ صحرا ہی طُور تھا گویا

تری نظر کو رہی دید میں بھی حسرتِ دید
خنک دلے کہ تپید و دمے نیاسائید

ترے نصیب کا آخر چمک گیا اختر — علی کے سینے میں جو راز تھا کھلا تجھ پر
گری وُہ برق تری جانِ ناشکیبا پر — کہ خندہ زن تری ظلمت تھی دستِ موسیٰ پر

تپش ز شعلہ گرفتند و بر دلِ تو زدند
چہ برقِ جلوہ بخاشاکِ حاصلِ تو زدند

ادائے دید سراپا نیاز تھی تیری — کسی کو دیکھتے رہنا نماز تھی تیری
نمازِ عشقِ حسینِ حجاز ہے گویا — یہی نمازِ خدا کی نماز ہے گویا

---

۱ حضرت سلیمان فارسی رحمۃ اللہ علیہ ۔ ۲ حضرت اُویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ ۔

اذاں ازل سے ترے عشق کا ترانہ بنی
نماز اس کے نظارے کا اک بہانہ بنی

خوشا وہ وقت کہ یثرب مقام تھا اُسکا
خوشا وہ روز کہ دیدار عام تھا اُسکا

اقبال

ظفر کی موت

یہ نظم حضرتِ گوہر کے جگر گوشہ عبد الرحمٰن ظفر علی مرحوم کی موت کا ماتم ہے - ہم کو حضرتِ گوہر سے دلی ہمدردی ہے - خدا اُنکو اِس صدمۂ جانکاہ کی برداشت کی طاقت اور صبر جمیل عطا فرماوے -

یہ کیا سبب ہے الٰہی کہ چرخِ کجرفتار
اُڑا رہا ہے بصد یاس سر پہ خاک و غبار

یہ کس کی سوزشِ غم نے جلا دیا اس کو
چڑھا ہوا ہے جو خورشیدِ صبح کو بھی بخار

یہ کس کا غم ہے کہ اُترا ہے منہہ ستاروں کا
یہ کیا الم ہے کہ ماہِ دو ہفتہ ہے بیمار

ہوائیاں سی یہ کیوں اُڑ رہی ہیں چہرہ پہ
اُداس کیوں نظر آتے ہیں صبح کے رخسار

یہ کس کے سوگ میں پہنا ہے ماتمی جوڑا
اُتار کر شبِ مہ نے دو شالۂ زرکار

ذرا سا منہہ نکل آیا ہے کیوں یہ غنچوں کا
یہ کس کے غم میں گلوں کا ہی آج سینہ فگار

یہ کس کا سانحۂ جانکاہ ہے کہ شبنم بھی
بہائے جاتی ہے آنکھوں سے اشکِ حسرت بار

یہ کیوں نسیمِ سحر آہ سرد بھرتی ہے
یہ کس کے بَین میں بےخود ہے بلبلِ گلزار

چمن سے کس گلِ رعنا نے آج کوچ کیا
بڑھائے بیٹھی ہے زیور جو نو عروسِ بہار

یہ کس عزیز غریب الوطن کا ماتم ہے
کہ رو رہے ہیں گلے ملکے آج لیل و نہار

یہ کس کی مرگِ مفاجات کی خبر سُنکر
مٹا رہی ہے ہوائے خزاں چمن کا سنگھار

وہ کونسا گلِ خوبی قضا نے سونپا ہے
کہ غم سے سینہ تربت ہوا ہے ناہموار

بنا ہے صحنِ چمن عمکدہ یہ کیا باعث
نہ غنچہ محو تبسم نہ صرف خندہ ہزار

نہ بلبلوں کے وہ نغمے نہ رقصِ طاؤساں
درختِ خاک بسر سبزہ پائمالِ غبار

نہ جام لالۂ احمر میں بادۂ رنگیں
نہ چشمِ نرگس شہلا میں کچھ نشہ کا خمار

زبان بند ہے وہ چپ لگی ہے سوسن کو
نہ چھیڑ چھاڑ نہ طعنہ نہ شوخیٔ گفتار

بنائی شکل ہے سنبل نے سوگواروں کی
کھلے ہیں بال پریشاں ہے طرّۂ طرّار

ظفر تمہیں بھی خبر ہے تمہارے مرنے پر
ہوئی تمہارے عزیزوں کی کیسی حالت زار

سعید بیٹوں کا شیوہ تو یہ نہیں ہوتا
کہ دیکھیں روتا ہوا اپنی ماں کو زار و قطار

یہ کیا ستم ہے کہ تم بے خبر ہو اے بیٹا
غمِ فراق سے جس نے کیا ہے سینہ فگار

تمہارے باپ کا ماں کا تمہاری دادی کا
تمہارے بھائیوں کا لے گیا جو صبر و قرار

مگر تمہاری نہیں کچھ خطا ظفر اس میں
نگاہتیں یہ عبث تم سے یہ گلے بیکار

کہاں ہے نقد دوائے اجل زمانہ میں
نہیں زمانہ کو جب آپ ہی سکون و قرار

یہ اضطراب ہے کمزوریوں کے باعث سے
ہمیں تو چاہیئے ہونا خدا کا شکر گذار

کہ اُس نے تم کو حقیقی حیات طیب دی
اُٹھا لیا میرے سر سے تمہاری فرض کا بار

نجات تم کو زمانہ کے درد سے بخشی
دیا ہے رہنے کو تم کو بہشت کا گلزار

کسے خبر ہے کہ تم کس طرح بسر کرتے
کسے خبر ہے کہ کیسی گذرتی آخرِ کار

یہی دعا ہے کہ جس طرح تم گئے معصوم
خدا ہمیں بھی اٹھائے باحمدِ مختار

رہیں تو دینِ محمد پہ برقرار رہیں
چلیں تو ساتھ چلے ظلِّ عیسیٰ دادار

ذوالفقار علیخان گوہر رامپوری

صورت و سیرت

حسن صورت نے یہ اک روز بصد ناز کہا
نیک سیرت سے کہ میں بھی ہوں عجب چیز بنا

کونسا دل ہے وہ جسمیں نہیں میری اُلفت؟
کونسی آنکھ ہے وہ جو نہیں میری شیدا؟

وہ ہے مرغوبِ طبائع وہ ہے محبوبِ قلوب
میں سوالیدِ ثلاثہ میں سے ہوں جسکو ملا!

قیسِ نجدی کو کیا کس نے بالآخر مجنوں؟
میں نہ ہوتا تو بھلا چیز ہی کیا تھی لیلےٰ!!

شہرتِ عام میری وجہ سے وامق کو ہوئی
میں ہی تھا جسکو سمجھ رکھا تھا اُس نے عذرا!

میں نے ہی اسکو کیا کوہ کنی پہ مائل
سوجھتا کچھ نہ تھا فرہاد کو شیریں کے سوا!

غور فرمایئے اور اس میں تھے کیا لعل ٹکے؟
میری ہی وجہ سے مجنوں ہوا ستی پہ فدا

اک انہی پر نہیں موقوف جدھر کیجے نظر
شش جہت میں ہیں کرشمے میرے ہر جا صد ہا

کہو احسنت جمادات میں دیکھو جو مجھے!
گر نباتات میں پاؤ تو کہو صلِّ علےٰ!

شاعروں کے ہوئے منظورِ نظر نرگس و گل
چشمِ بینا نے جو انکی نہ مجھے ان میں دیکھا

ان میں میری نہ جھلک ہو تو ہیں خضرا یہ دمن
لالہ و یاسمن و نسترن و دھر گیا

میں نہ شامل ہوں تو ہر ایک ہو کنکر پتھر
لعل - یاقوت - زمرد ہو کہ موتی - ہیرا

مجھ کو چلتا ہوا جادو جو کہیں زیبا ہے
حُب کا نایاب عمل سمجھیں تو بالکل ہے بجا!

خود ہے اللہ جمیل اور اُسے محبوبِ جمال
ذکر انساں کا کیا چاہتا ہے مجھ کو خدا!!

ختم جب کر چکا تقریر یہ حُسنِ صورت
حُسنِ سیرت نے کہا صدّقنا - اٰمنّا

جسقدر آپ نے اوصاف کیے اپنے بیاں
میرے نزدیک ضرورت نہ تھی اسکی حاشا

فیض خورشید سے آگاہ ہیں دنیا میں سبھی
لیکن اُس نے کبھی تعریف کی اپنی نہ ثنا

شہد کو حق نے کہا فِیہِ شِفَاءٌ لِلنَّاس
اپنے مُنہہ سے نہ کہا اُس نے کہ مَیں ہُوں مِیٹھا

خوشنوا کہتے ہیں بُلبل کو تو گُل کو رنگیں
زعم پر اُس کو نہ کچھ اُسکا نہ اسکو دعویٰ

اس قدر اَوج پہ گردُوں کی تواضع دیکھو
یہ جھکا ہے کہ زمیں پر ہے بچھا سا پڑتا

خودستائی ہے بڑا عیب اگرچہ - لیکن
آپ کے واسطے تعریف ہے اپنی زیبا

آپ کی خوبی و محبوبی میں شک ہے کس کو
غور کیجے تو نہیں میرا بھی کچھ کم رُتبا

لعل و الماس و زمرّد تو بڑی چیز ہُوئے
دیکھیے حنظلِ ناچیز کی شکلِ زیبا!

دیکھ کر صورتِ خوب اس کی وُہ رنگِ مرغوب
نظرِ شوق کو ہے لُطف سا آیا کرتا!

خاک ہو جاتا ہے نظّارے کا پر سب یہ مزا
دھیان آنے سے کہ ہے ذائقہ اُسکا کڑوا!

حُسنِ صُورت بھی ہے اِک موہنی منتر بیشک
حُسنِ سیرت ہو اگر ساتھ تو پھر کیا کہنا

صُورتِ خوب بھی ہے ایک طرح کا جادُو
سیرتِ نیک کو اعجاز جو کہیے ہے بجا

صُورتِ خوب پہ بدخُلق اگر ہو کوئی
ہے وُہ اِک پھُول کہ جس میں نہیں خوشبو اصلاً

حُسنِ سیرت کسی بدشکل کو حاصل ہو اگر
ایک نہتے کو ملا آلۂ فتحِ دُنیا!

پر نہ وُہ اُس پہ کچھ اترائے نہ یہ ناز کرے
دونو یہ عیب ہیں سخت ایک سے ہو ایک بُرا

آپ ہیں گر گُلِ خوشرنگ تو مَیں ہوں نکہت
آپ خوشبو۔ میں نسیمِ سحری کا جھونکا

آپ گر شمعِ فروزاں ہیں تو مَیں لمعۂ نور
آپ ہیں چاند تو مَیں اپنی جگہ شمسِ ضحےٰ!

فوق کچھ آپ کو مجھ پر نہ مجھے آپ پہ کچھ
غور کیجے تو ہے دونوں کا برابر درجا

حُسنِ صُورت کے لئے سیرتِ نیکو زیور
حُسنِ سیرت کے لئے صُورتِ زیبا گہنا

سیّد علمدار حسین بنوڑی

نقشِ عبرت

جناب عرش ایک مشاق اور ذی استعداد اہل سخن ہیں۔ اس نظم میں نہایت خوبی سے انقلاب زمانہ کی تصویر کھینچتے ہیں جو قابلِ داد ہے۔

واسطے سیر کے گلشن میں گیا تھا میں کل — عیش و آرام میں بلبل کے نہ تھا کوئی خلل
ہائے اے بادِ خزاں تُو نے دیا رنگ بدل — آج دیکھا جو وہاں تھے نہ تو وُہ پھول نہ پھل

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدیم کہ بہار آخر شد

خواب سے کرتے نہیں آکے انہیں کیوں بیدار — کیا ہُوئے اُنکے وُہ احباب وہ یار و غمخوار
زندگی سے تو یہ کل تک نہ تھے کچھ بھی بیزار — آج کیوں آکے ہیں سوئے ہُوئے یوں زیرِ مزار

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدیم کہ بہار آخر شد

زندگی پر جو ہیں بھولے ہُوئے ہیں دیوانے — نہ تو میخوار رہینگے۔ نہ سدا میخانے
یک قلم بھول گئے رات کے سب افسانے — ہیں دمِ صبح نہ وہ شمعیں نہ وُہ پروانے

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدیم کہ بہار آخر شد

یہی دہلی ہے جسے کہتے تھے سب رشکِ جناں — دم اُلجھتا ہے مرا آج اُداسی سے یہاں
کل جو تھا تخت نشیں ہے وُہ شہنشاہ کہاں — کیا ہُوئے آج مکیں اور ہُوئے کیا وُہ مکاں

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدیم کہ بہار آخر شد

صورتیں ہیں تو ۔ مگر ہائے وُہ صورت نہ رہی اب وُہ دن سن نہ رہے اب وہ طبیعت نہ رہی
کس سے کیجئے اُلفت کہ وُہ اُلفت نہ رہی دوستوں میں وُہ جو تھی تھوڑی مروّت نہ رہی

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

ہے بقا ذاتِ خدا کو نہیں اس سے انکار اور جو شے ہے فنا ہونے کو ہے وُہ تیار
کل تو تھا قیس یہاں اور ہی کچھ تھے آثار کیا سبب آج جو سنسان ہیں دشت و کہسار

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

ہیں امیر[1] آج کہاں اور وہ فریاد[2] و رفیق[3] کیا ہوئے حشر[4] و ضیا[5] آہ[6] و نفیس[7] اور لئیق[8]
عیش[9] و خورشید[10] کہاں اور کہاں ہیں وُہ شفیق تھے مرے دَور میں یہ اہلِ صفا پاک طریق"

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

اب نہ وُہ سیر خنکی اور نہ وُہ رنگِ فضا ٹھنڈی ٹھنڈی نہ ہوا ہے نہ پتا سبزے کا
نہ تو ساحل ہے نہ پیاسے ہیں نہ ہے وُہ نقشا نہ وُہ ملّاح نہ کشتی ہے نہ ہے وُہ دریا

حیف در چشمِ زدن صحبتِ یار آخر شد
رُوئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

مسجدیں چھوڑ گئے تھے جو سلاطینِ زماں جز ابابیل کہاں رہتے ہیں انسان وہاں
اب موذن سے جو دینے کو کہے کوئی اذاں صاف کہدے کہ ہے جنّات کا اب تو وہ مکاں

[1] امیر مینائی مرحوم۔ [2] مولوی غلام حسین فریاد ہڈ مولوی گیا ضلع اسکول۔ [3] دوست ہیچمدان۔ [4] مولوی فصیح احمد حشر گیاوی۔ [5] میاں علی رضا ضیا عظیم آبادی۔ [6] شیخ ذوالفقار علی عرف صوبہ آہ گیاوی۔ [7] جناب میر خورشید علی صاحب نفیس لکھنوی خلف انیس مرحوم مرثیہ گو۔ [8] لئیق اشرف سہسرامی تلمیذ مصنف۔ [9] نواب لیاقت علی خاں عیش رئیس داؤد نگر گیا۔ [10] خورشید لکھنوی مولف افادات ۱۲

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

دیکھے ہیں گردشِ ایام کے نقشے کیا کیا جھوٹھے وُہ آپ ہیں کہتے ہیں جو ہم کو جھوٹھا
جس میں کل تک نظر آتے تھے مسافر صدہا آج سنسان ہو ویران ہے بالکل وہ سرا

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

آتشِ جوش میں وُہ شعلہ فشانی نہ رہی خشک دریا کی طرح دل میں روانی نہ رہی
شاعری اُٹھ گئی - وُہ مرثیہ خوانی نہ رہی عرشؔ میں پیر ہوا میری جوانی نہ رہی

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

عرشؔ "مصنّف حیاتِ تسلیم"

ترکیب بند

پچھلے سال جب علیگڈھ کی انجمن الفرض کا ڈپوٹیشن حیدرآباد دکن گیا تھا - تو ان کے لئے کئی عالیشان جلسے کئے گئے تھے - اُن میں ایک جلسہ کا اہتمام مسٹر ظفر علیخاں کی طرف سے تھا - اور اس جلسہ میں جناب ضامن کنتوری نے ایک نہایت عمدہ نظم بصورت ترکیب بند پڑھی تھی جس کے پہلے تین بند درج کئے جاتے ہیں :-

لائی ہے بادِ صبا مژدہ فصلِ بہار عرش ہے گوہر فشاں فرش جواہر نگار

سبزۂ نورستہ ہے یا کہ بساطِ حریر
قطرۂ شبنم ہیں یہ یا گہرِ آبدار

لالہ و گل سے بنے معدنِ یاقوت و لعل
گلبن و بستاں سرا دشت و دمن کوہسار

ایک طرف خندہ رُو یاسمن و نسترن
ایک طرف مستِ ناز سرو لبِ جوئبار

موجۂ بادِ نسیم جنبشِ نبضِ رواں
رشتۂ جانِ بہار سنبلِ پیچاں کے تار

غنچہ تہِ برگِ سبز صُرّۂ گنجِ نشاط
گل لبِ شاخسار تاجِ سرِ افتخار

سادگیِ برگ میں رنگِ امل کی جھلک
خامیِ اثمار میں چاشنیِ انتظار

چاشنیِ انتظار میوۂ امّید کی
میوۂ جنّت سے ہے خوش مزہ و خوشگوار

گھیرے ہے ہم کو مگر یاس ہر اک سمت سے
شاہدِ اُمّید نے کر دیا خالی کنار

اب کسے سمجھائیں ہم اور کسے تسکیں دیں
دل ہے الگ بیقرار چشم الگ اشکبار

گلشنِ اسلام میں دورِ خزاں آگیا
نکبت و ادبار کا ابرِ سیہ چھا گیا

یاد ہیں وہ دن کہ تھا باغ تمنا ہرا
گلشنِ اسلام میں دخل خزاں کا نہ تھا

دولت و اقبال میں حشمت و اجلال میں
کوئی جہاں میں نہ تھا ہمسر و ہم مرتبا

فتح و ظفر تھے نقیب راہنما تھا نصیب
پھر گئے قوموں کے رُخ ہم نے جدھر رُخ کیا

ابرِ ترقی یہ تھا یا کوکبۂ احمدی
دیکھتے ہی دیکھتے چار طرف چھا گیا

کر دیا قوموں کو ایک ہو گئے بد سار نیک
شرع کی تعلیم نے خوبیاں دیں سب سکھا

دینِ مبیں نے کئے ایک سیاہ و سپید
شامی و رومی کا فرق ہم میں نہ باقی رہا

یاوری بخت سے ہاتھ لگا تاج و تخت
پیروی عقل سے مل گئی راہِ ہُدیٰ

خاک نشینی یہ تھے مہرِ سپہرِ عُروج
نقشِ قدم جنکے ہیں زینۂ بامِ عُلا

خادم و مخدوم کا فرق نہ تھا قوم میں
سلسلۂ اسلام کے ایک تھے شاہ و گدا

شمعِ طریقِ عمل ملّتِ بیضا ہوئی
رسمِ اخوّت بنی حبلِ متین ولا

شانِ اخوت سے تھی شان سب اسلام کی
یکجہتی پر بِنا ہوتی تھی ہر کام کی

جب سے کہ بدلا یہ رنگ اَور ہی عالم ہوا — تھا جو نہالِ مُراد وُہ شجرِ غم ہوا
بادِ سموم نفاق چلنے لگی چار سمت — کینہ و بغض و حسد ذائقہ سم ہوا
گھٹ گئیں غمخواریاں بڑھگئیں عیاریاں — جاتی رہیں یاریاں جوشِ صفا کم ہوا
سلسلۂ اتحاد قوم کا شیرازہ تھا — ٹوٹتے ہی جس کے سب دفتر برہم ہوا
شیعہ و سُنّی کی جنگ فارسی تُرکی کی جنگ — تا ابد تفرقہ ہم میں مسلّم ہوا
ناصحِ مشفق کا نام ہجو میں آنے لگا — جس نے کہی نیک بات مستحق ذم ہوا
کوششِ رفعِ نفاق گذری دلوں پر گراں — بارِ جہالت سے قد حلقۂ خاتم ہوا
نیچریوں کا گروہ قابلِ لعنت بنا — چارہ گری کا صلہ قعرِ جہنم ہوا
نوحۂ مرگِ پدر نغمۂ عشرت فزا — اور ترقی کا راگ نوحۂ ماتم ہوا
عقل پہ پتھر پڑے ہوگئی اُلٹی سمجھ — ہر ادب آموزِ قوم جہل مجسم ہوا

خواری و ذلت کو بھی سمجھے کہ اقبال ہے
ساری تباہی کی جڑ زشتیٔ اعمال ہے

قریۂ ویران

اے مرے اَو برنِ دلکش۔ قریۂ راحت فزا! — قرب کے گانوں میں تیری فرد تھی نشو و نما
خطۂ زرخیز تیرا اس قدر آباد تھا — راس تھی کچھ ایسی کھیتوں کو تری آب و ہوا
فصل یاں ہوتی تھی پوری۔ گاؤں والے شاد تھے — تندرستی کے دھنی تھے ہر طرح آباد تھے

آیا کرتی تھی یہاں آغازِ موسم میں بہار
ٹھہرا کرتا تھا زمستاں کا یہاں پچھلا نکھار

سادہ و دلکش تھے تیرے پنج ہائے پُرفضا
تھے یہ ایّامِ جوانی میں مری آرامگاہ

جبکہ آتا تھا مجھے ہر مشغلہ میں اِک مزا
سیرِ سبزہ زار کی کرتا تھا تیرے بارہا

تیرے ہر منظر سے ہوتی تھی مجھے فرحت نصیب
بارہا دیکھی ہیں رُک کر تیرے اشیائے عجیب

وہ پھلا اور پھولا مزرعہ - جھونپڑا وہ سایہ دار
وہ سدا لبریز چشمہ - آسیا سرگرمِ کار

وہ کلیسائے مصفّا - اُونچے اُونچے دلپسند
قرب کے ٹیلوں سے سر رکھتے تھے جو اپنا بلند

کانٹے والی جھاڑیاں تھی جنکے پردے میں نہاں
رازگوئی کے لئے خلوت سرائے عاشقاں

ایک جال جُل کے جنکے اوٹ میں پیرِ کہن
خوب تھے آپس میں کرتے گرم بازارِ سخن

اُف رے اس دن کی تمنّا اس دلِ شیدا کی جب
فکرِ دنیا سے بھی ملتی فرصتِ عیش و طرب

اور آتے تھے اُمڈ کر گاؤں کے برنا و پیر
مرد و زن ادنےٰ و اعلےٰ - کیا غریب اور کیا امیر

دُور از رنج و محن - آزاد از فکرِ جہاں
زیرِ اشجارِ مبسّط کھیلتے تھے شادماں

زیرِ سایہ کھیل ہوتے تھے عجب انداز کے
نوجواں لڑتے تھے آپس میں تو بوڑھے دیکھتے

بیسیوں نیرنگیاں دکھلائی جاتی تھیں یہاں
علم و فن کی کارسازی - جوہرِ زورِ بیاں

ختم ہو چکتا تھا جب ہر کھیل دو یا تین بار
اور کھیلوں کی طرف دیتا تھا مجمع دل اُبھار

بھولے بھالے گانوں والے کو نہ تھا ہرگز گماں
یہ کہ ہے کالک کا ٹیکا اُس کی چہرے پر عیاں

اور اُس کے چار سو کل دیکھنے والے کھڑے
چپکے چپکے کیا لگاتے تھے مزے کے قہقہے!

شرمگیں دوشیزہ کا ترچھی نگہ سے دیکھنا!
اور انکو سن رسیدہ عورتوں کا گھورنا!

تھیں یہ تیری خوبیاں اے قریۂ راحت فزا
جلد جلد ایسے تماشے ہوتے رہتے تھے سدا

اِن سے محنت اور مشقت میں بھی آتا تھا مزا
اِن سے ہو جاتی تھی دُونی سبزہ زاروں کی فضا

تجھ میں تھیں ایسی بہاریں - قریۂ رشکِ جناں!
پردہ اگلی سی فضا وہ حُسن و صورت اب کہاں!

اَے مقامِ دلکشا! اَے قریۂ راحت فزا
کیا ہُوئے تیرے تماشے۔ تیری وُہ نشو و نما

کُنج میں آتا ہے تیرے ہاتھ ظالم کا نظر
چھا رہی ہے مُردنی سی تیرے سبزہ زار پر

ایک ہی مالک کا تیری سرزمیں پر ہے مدار
نصف مزرعہ رہگیا ہے انتہائے کشت زار

اب کہاں اگلی سی تیری آبشاروں میں صفا
چشمۂ شفاف میں وُہ روزِ روشن کی ضیا

ہر طرف موجیں بھری ہیں اب خس و خاشاک سے
اب نظر آتے ہیں بہتے چشمے کچھ ناپاک سے

مرغزاروں میں تیرے۔ وُہ تیرا تنہا میہماں
یعنے اِک مسکین بگلا با صدائے پُرفغاں

پاسبانی کرتا ہے اپنے نشیمن کی سدا
(ڈر کسی دشمن کا گویا اُس کے ہی دل میں لگا)

مُرغِ آبی۔ ایک رہِ متروک پر اُڑتا ہُوا
کرتا ہے شورش سے اپنی بدمزہ اسکی صدا

کیسے ویراں ہو رہے ہیں مرغزارِ دلپسند
ہو گئی ہے گھاس دیوارِ شکستہ سے بلند

کانپتے۔ ڈرتے ہُوئے ظالم کے دستِ جور سے
تیرے بچے دُور کے مُلکوں میں اب ہیں جا بسے

ہے جہاں زر کو ترقی اور انساں کو زوال
ایسے مُلکوں کا بُرا اکثر ہوا کرتا ہے حال

اغنیا کی گر نا ممکن ہے سرِ نو سے اُبھار
باتوں باتوں میں ہوا کرتا ہے اُنکا اقتدار

پر ہُوئی دیہاتیوں کی قوم گر زیر و زبر
غیر ممکن ہے پنپنا ان جوانمردوں کا پھر

وُہ بھی تھا کوئی زمانہ فرخ و میموں قدم
خطۂ انگلینڈ سے جب دُور رہتا نامِ الم

جبکہ دو گز سرزمیں تھی اپنے مالک کا عصا
کیونکہ ادنے محنتوں سے ہوتا تھا حاصل سوا

اِتنا ہی ہوتا تھا حاصل تھی ضرورت جس قدر
پر نہ تھا ملنے کا حاجت سے زیادہ شمہ بھر

سادگی اور تندرستی اس کے یارِ خوشخصال
اور دولت اسکی تھی بے علمئ مال و منال

اب گئے وُہ دِن کسانوں کا گیا اب اقتدار
سنگدل تجار کی اب ہر طرف ہے گیر و دار

منتشر قریوں سے پہلے تھا بسا جو مرغزار
اب ہی اُونچے اُونچے ایوانات کا دار القرار

ہم عنانِ وجاہ و ثروت یعنی طرفہ حاجتیں
کِبر و نخوت کا نتیجہ رُوح فرسا کلفتیں

ہر طرف چھائی ہُوئی ہے انکی اب کالی گھٹا
مٹ گئی اگلے زمانہ کی بہادر دل کُشا

اب کہاں اگلے سے وہ اوقاتِ پُرعیش و سرور
جن سے استغنا نے رکھا تھا غبارِ فکر دور

اب کہاں وہ آرزوہائے قلیل و خوشگوار
امرِ مشکل تھا نہ جنکا پورا ہونا زینہار

اب کہاں وہ صحت افزا مشغلے ای دوستدار
جن سے تھی آنکھوں کو ٹھنڈک اور سبزوں کی بہار

چل بسے اب سب کے سب ایک اور ساحل کیطرف
ہیں جہاں اک آدھ باقی یادگارانِ سلف

قریۂ راحت فزا! اے صورتِ فصلِ بہار!
جورِ ظالم کے ہیں منظر تیرے اُجڑے مرغزار

اب تیری راہِ مسلسل کشتِ ویراں پر اگر
جا نکلتا ہوں کسی دن میں اکیلا بھول کر

جب نظر آتا ہے مجھ کو بعد مدت وہ مقام
جس جگہ تھے جھونپڑے اور جھاڑیاں واقع تمام

یاد آجاتی ہے مجھ کو تیری اگلی داستاں
سامنے آنکھوں کے پھر جاتا ہے وہ گذرا سماں

ہُوک سی اُٹھتی ہے دل میں دیکھ کے صورت تری
اے گلِ پژمردہ یہ کیا ہوگئی رنگت تری!

تھا جنوں سا جس زمانے میں مرے سر پر سوار
گردشِ ایام کے جب ہورہے تھے مجھ پر وار

ہائے وحشت جب لئے پھرتی تھی مجھ کو در بدر
پر نہ ملتا تھا کہیں افکارِ دنیا سے مفر

تھا اسی اُمید سے دل کو سہارا صبح و شام
آئیگی جب صبحِ پیری موت کا لیکر پیام

آئیگا بھرنے کو جب اس زندگانی کا ایاغ
اور جب بجھنے لگے گا اپنی ہستی کا چراغ

زندگی کی چپقلش سے پھیر کر آخر زمام
پھر کرونگا سبزہ زاروں میں ترے آکر قیام

تاکہ ہوں ایامِ پیری عیش و راحت سے بسر
اور اپنی شمع بجھنے سے بچے پیش از سحر

یہ بھی تھی دل کی تمنا فخر اور پندار سے
مبتلا ہیں جس مرض میں سارے چھوٹے اور بڑے

گرد مجمع کے کسانوں کو بٹھا کر وقتِ شام
گوش زد انکے کرونگا سرگذشت اپنی تمام

اور دکھلاؤنگا اپنے علم کی اُن کو بہار
جس سے ہو جائیگا زائد گاؤں میں اپنا وقار

جس طرح خرگوش کوئی ازپئے جانِ عزیز
اوّل اوّل گو خوشی سے کرتا ہو کیا کیا گریز

گھیر کر لاتی ہے لیکن پھر قضا اُسکو وہیں
بھاگ نکلا تھا جہاں سے با دلِ اندوہگین

مجھ کو بھی اُمید یہ تھی عمر کے پچھلے دنوں
جسجگہ ادبار و تردد کے زمانے ختم ہوں

تیرے ہی آغوش میں ہو زندگی اپنی بسر — مسکنِ مالوف میں اپنا بندھے رختِ سفر

محمد شہاب الدین خان

(ترجمہ از گولڈ سمتھ)

ویران مکان

مخزن کے گذشتہ نمبر میں ایک مختصر سا مضمون اُجڑا ہُوا گھر مترجمہ پیرزادہ بشیر احمد صاحب چھپا تھا۔ حضرت احسن صاحب کو یہ مضمون بہت پسند آیا اور وہ نہایت خوبی سے نظم کرکے بغرضِ اندراج ہمارے پاس بھیجتے ہیں:-

خراب موت سے ہستی کا کارخانہ ہوا — مکان رہ گیا خالی مکیں روانہ ہوا
کرایہ دار تھے اس گھر کے زندگی و خیال — اسی مکاں میں گذاری تھی عمر سالہا سال
نہ اپنے جانے پہ کوئی نشان چھوڑ گئے — شکستہ حال سا خالی مکان چھوڑ گئے
کچھ ایسے مضطرب الحال دل ملول گئے — کہ گھر کی کھڑکیاں بھی بند کرنا بھول گئے
ہے اُن دریچوں میں بے رونقی کی مہمانی — جہاں تھی نور کی دو پتلیوں کی دربانی
ہر ایک حصّہ میں اس گھر کے کیا اندھیرا ہے — چہار سمت سے وحشت نے آکے گھیرا ہے
کھلے پڑے ہیں بھیانک وہ آج دروازے — ہزار بار جو کھلتے تھے بند ہوتے تھے
چہل پہل ہے نہ ہنگامہ گفتگو کا ہے — مکانِ عیش جو تھا وہ مقام ہُو کا ہے
ہوس تھی جس میں بسی وہ ہوا نہیں آتی — خموشیاں ہیں۔ کہ کچھ بھی صدا نہیں آتی
خدا کسی کو دکھائے نہ ایسا سنّاٹا — ہر اک طرف نظر آتا ہے کیسا سنّاٹا
نہ انجمن ہی رہی اور نہ انجمن آرا — مکان کیسا یہ ڈھنڈھار ہو گیا سارا

کھلے ہوئے ہیں جو در اُن پہ ڈال دو پردے — کہ میرے دل کو یہ وحشت نہ مضطرب کر دے
یہ بے نشاں سا رہیگا نشان مٹی کا — ملا دو مٹی میں اب یہ مکان مٹی کا

احسن لکھنوی

دمِ واپسیں

ذیل کے اشعار حضرت اعجاز نے اپنی ایک سالہ بھتیجی کی وفات حسرت آیات کی یادگار میں لکھے ہیں۔ یہ نظم مسافرِ عدم کی حالت کی ایک صحیح اور اعلیٰ درجے کی تصویر ہے۔ اسی مضمون پر ایک انگریزی شاعر ٹامس ہڈ کی نظم "بسترِ مرگ" بھی نہایت خوب ہے۔ ان دونوں نظموں کے مقابلے سے مشرقی اور مغربی طرزِ فکر و طرزِ ادا کا فرق معلوم کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا :-

عناصر کی کشاکش تھی بلا کا درد پنہاں تھا — قیامت تھی ذرا سی جان کو رنجِ فراواں تھا
جُدائی رُوح میں اور جسم میں بیڈھب لڑائی تھی — کہ ہر پیغامِ صلح و آشتی اک آفتِ جاں تھا
تماشا تھا مریضِ نیمجاں بیزار جینے سے — عزیزوں کو تلاشِ چارہ گر تھی فکرِ درماں تھا
گڑی تھیں سانس پر نظریں یہاں آیا یہاں آیا — وہ اک تارِ نفس سلکِ دُرِ صد بحر ارماں تھا
سکبساری تھی واں مدِ نظر بابِ علائق سے — یہاں ارمان بھرا دل زیرِ بارِ یاس و حرماں تھا
وہاں قطرہ کو بیتابی فنا فی البحر ہونے کی — یہاں ہر قطرۂ اشکِ الم ہمشکلِ طوفاں تھا
حواسِ مرکہ تھے مجتمع واں سر کی گرمی میں — یہاں شیرازہ عقل و فہم کا یکسر پریشاں تھا
وہاں دم ٹوٹتا تھا اپنی ہمت ٹوٹی جاتی تھی — وہاں ہونٹوں پہ دم تھا لب پہ اپنی شورِ افغاں تھا

بدن ٹھنڈا ہوا جاتا ہے۔ اب کس کام آئیگا
ہمیں کو پھونکنے کو تو مگر اے سوزِ پنہاں تھا

وُہ سُلطانِ جہاں جاں جہاں تھی جانِ جاناں تھی
چلے جاتے ہی اُسکے خانہ دل اپنا ویراں تھا

لگایا فانیوں سے دل تم اے اعجاز ناداں تھے
وُہ ننھی زندگی اک خواب تھا عبرت کا ساماں تھا

تازہ غزلیں

نگاہ پائی ازل سے جو نکتہ ہیں میں نے
ہر ایک چیز میں دیکھا اُسے کمیں میں نے

سوالِ دید میں لذّت ہے اے کلیم ایسی
ہزار بار سُنی ہے وُہی نہیں میں نے

قطعہ

سُنے کوئی مری غُربت کی داستاں مجھ سے
بھلایا قصّۂ پیمانِ اوّلین میں نے

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنّت میں
پیا شعور کا جب جامِ آتشیں میں نے

رہی حقیقتِ عالم کی جستجو مجھ کو
دکھایا اوجِ خیالِ فلک نشیں میں نے

ملا مزاج تغیّر پسند کچھ ایسا
کیا قرار نہ زیرِ فلک کہیں میں نے

بنا کعبے سے پتھر کی مُورتوں کو کبھی
کبھی بتوں کو بنایا حرم نشیں میں نے

کہا کسی نے فسانہ جو عشق کسی کا
وُہ سادہ لوح ہوں میں کر لیا یقیں میں نے

کبھی میں ذوقِ تکلّم میں طُور پر پہنچا
چھپایا نُورِ ازل زیرِ آستیں میں نے

کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کیا فلک کو سفر چھوڑ کر زمیں میں نے

کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں
دیا جہاں کو کبھی جامِ آخریں میں نے

کبھی میں قتل ہوا کربلا کے میداں میں
کبھی کسی کو ستم پر بھی آفریں میں نے

سُنا یا ہند میں آکر سرودِ ربّانی
پسند کی کبھی یُونان کی سرزمیں میں نے

دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سُنی
بسایا خطّۂ جاپان و ملکِ چیں میں نے

بنایا بندوں کی ترکیب سے کبھی عالم
خلافِ معنیٔ تعلیمِ اہلِ دیں میں نے

اُٹھائے "تلخیٔ انکار" میں مزے کیا کیا
بنا کے ایک زمانے کو نکتہ چیں میں نے

لہو سے لال کیا سینکڑوں زمینوں کو
جہاں میں چھیڑ کے پیکارِ عقل و دیں میں نے

سمجھ میں آئی حقیقت نہ جب ستاروں کی
اِسی خیال میں راتیں گذار دیں میں نے

ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
سکھایا مسئلۂ گردشِ زمیں میں نے

کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر
لگا کے آئینۂ عقل دُوربیں میں نے

کیا اسیرِ شعاعوں کو برقِ مضطر کو
بنا دی غیرتِ جنّت یہ سرزمیں میں نے

مگر خبر نہ ملی آہ! رازِ ہستی کی
کیا خرد سے جہاں کو تہ و تگیں میں نے

ہُوئی جو چشمِ مظاہر پرست وا آخر
تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

عجیب طرز ہے کچھ گفتگوئے واعظ کا
خُدا بچائے یہ باتیں سُنی نہ تھیں میں نے

وُہ چیز نام ہے جس کا جہاں میں آزادی
سُننی ضرور ہے دیکھی کہیں نہیں میں نے

نہ توڑ میرے دلِ دردمند کو ظالم
بڑی تلاش سے پایا ہے یہ نگیں میں نے

خُدا تو ملتا ہے انسان ہی نہیں ملتا
یہ چیز وُہ ہے کہ دیکھی کہیں کہیں میں نے

عجیب شے ہے صنم خانۂ امیرِ اقبال
مَیں بُت پرست ہُوں رکھدی کہیں جبیں میں نے

اقبال

غزل

(از جناب حضرت مولوی شاہ معشوق علی صاحب تپش پھلواری)

اے میرے بخت خدا کے لئے بیدار بھی ہو
خواب ہی میں سہی اُس کا کہیں دیدار بھی ہو

کیا قباحت ہے اگر آج ہی دیدار بھی ہو
فرض ہی حشر بھی ہو مجمعِ اغیار بھی ہو

بے مدد چل سکے کیا۔ ملکِ عدم کو وہ غریب
خود بھی کمزور ہو عصیاں سے گرانبار بھی ہو

قتل ابرو سے کرو۔ یا کرو مژگاں سے ہلاک
کیا ضرورت ہی کہ نیزہ بھی ہو تلوار بھی ہو

دردو غم کا رہوں فرقت میں نہ کیونکر ممنوں
ان غریبوں کے سوا کوئی مددگار بھی ہو

طالبِ جلوہ سے یہ شرط عجب ہے اُن کی
دشت ایمن کا بھی ہو اور شبِ تار بھی ہو

مذہبِ عشق میں کامل ہے وہی اے زاہد!
ہاتھ میں سبحہ بھی ہو دوش پہ زنار بھی ہو

قتل میں عاشقِ بیدل کے تامل کیا ہے
جو کہ بیمار بھی ہو جینے سے بیزار بھی ہو

زینتِ دل ہے۔ تیرے یاد مژہ کا رہنا
حسنِ گل کا ہے یہی اُس میں کوئی خار بھی ہو

یاد میں کیوں رخِ روشن کے جلاتی ہو ہمیں
دل مرا طور ہو گیا۔ نور بھی ہو نار بھی ہو؟

پوچھو اُس قلبِ شکستہ سے ذرا خطرہ حشر
جسکو اُمید نہ ہو۔ اور گنہگار بھی ہو

لطف ہی دشت نوردی کا یہی جوشِ جنوں
آبلہ پاؤں میں ہو۔ وادیِ پُرخار بھی ہو

نکلے حسرت تو ہماری کسی صورت دل سے
تیرا پیکاں میرے سینہ کے کہیں پار بھی ہو

پا پیادہ چلوں کس طرح عدم کو اے موت!
ناتوانی سے یہاں طاقتِ رفتار بھی ہو

فصلِ گل آنے کی کیا اسکو خوشی ہو صیاد
پرشکستہ بھی جو ہو اور گرفتار بھی ہو

ہاتھ کیا اب ہی بڑھانا طرفِ جیبِ جنوں
دیکھ لے پہلے۔ گریباں میں کوئی تار بھی ہو

جلوہ اُس یار کا ہر ذرہ میں ظاہر ہے تپش
ہاں نظر والا کوئی طالبِ دیدار بھی ہو

غزل

مژدہ وصالِ یار کا آیا نہیں ہنوز
دیدارِ دوست آنکھ نے پایا نہیں ہنوز

ہو جس میں بوئے مہر و وفا گل نسیم سے
ایسا کوئی چمن میں کھلایا نہیں ہنوز

موسیٰ تو کوہِ طور پہ غش کھا کے گر پڑے
پردہ کو تو نے رُخ سے اُٹھایا نہیں ہنوز

بسمل تڑپ رہا ہے مگر تو نے عشق زخم
کاری جگر پہ کوئی لگایا نہیں ہنوز

بے تاب ہو گئے ترے جھونکوں سے اے نسیم
پیغامِ یار تو نے سنایا نہیں ہنوز

اچھی رہی کہ مفت میں بدنام ہو گئے
اور اشکِ چشمِ تر سے گرایا نہیں ہنوز

افسوس تو نے مرغِ نواخوانِ صبحدم
سوزِ درونِ عشق کو پایا نہیں ہنوز

اے آفتابِ حشر تو کیوں کانپنے لگا
میں نے تو داغِ دل کو دکھایا نہیں ہنوز

ابرِ بہار بھی ہے جنوں بھی ہے کیا سبب
دامن پہ ہاتھ اُس نے بڑھایا نہیں ہنوز

کیوں ساتھ چھوڑتا ہے سکندر کا تو خضر
آبِ حیات لب سے لگایا نہیں ہنوز

جل جل کے بجھ گئی شمعِ پیرِ مے فروش
ہم نے چراغِ دل کو جلایا نہیں ہنوز

دل سُننے والوں کا میرے نالوں سے ہل گیا
جو دل میں بھید تھا وہ جتایا نہیں ہنوز

برہم ہوئی ہے محفلِ اربابِ معرفت
صادق نے دردِ دل کو سنایا نہیں ہنوز

(صادق علی خاں)

غزل

ابرِ بہار جوش پر آیا نہیں ہنوز
دل کے تپش کو اُس نے بجھایا نہیں ہنوز

جلتا رہا دیا مری تربت پہ تا سحر
کیوں اے نسیم تو نے بجھایا نہیں ہنوز

کیا مجھ نیاز مند کے دل کی تمہیں خبر
ناز آپ نے کسی کا اُٹھایا نہیں ہنوز

ناصح نہیں ہے محرمِ اسرارِ عاشقی
اُس نے کسی سے دل کو لگایا نہیں ہنوز

ہم دوڑ کر پہنچ گئے محشر میں سر جھکائے
قاتل نے حکمِ قتل سنایا نہیں ہنوز

نالہ تو کرنے دیجئے کیوں آپ ڈر گئے
ہم نے تو آسماں کو ہلایا نہیں ہنوز

چھانا ہے نجد ناقۂ لیلیٰ کو رات بھر
گم گشتہ کا نشان بھی پایا نہیں ہنوز

آئی ہے جان لب پہ مری انتظار میں
لیکن غضب ہے یہ کہ وہ آیا نہیں ہنوز

شاید شہیدِ خنجرِ ناز و ادا ہوا
قاصد جوابِ نامہ جو لایا نہیں ہنوز

پہنچے ہیں یار منزلِ مقصود پر ہمیں
اے بختِ خفتہ تو نے جگایا نہیں ہنوز

فرصت کہاں حبیب اسے بزمِ غیر سے
گھبرا رہے ہیں ہم کہ وہ آیا نہیں ہنوز

سید حبیب جعفر خان

غزل

پی پلا کر اسے رحمت کی قسم دیتے ہیں
کیسے بندے ہیں کہ اللہ کو دم دیتے ہیں

اسی رفتار سے اٹھے گی قیامت اک دن
یہ خبر ہم کو ترے نقشِ قدم دیتے ہیں

[illegible]ں کی بھروں میں نہ آجائیگا بندہ نواز!
مفت کا آپ کو اغیار بھرم دیتے ہیں

[illegible] رہی ہے مرے ساقی کی عنایت مجھ پر
لے چھلکتا ہوا ساغر تجھے ہم دیتے ہیں

داغ دیتے ہو جو دل پر تو ذرا ٹھنڈک سے
مہر کے واسطے کاغذ کو بھی نم دیتے ہیں

دل جو قیمت نہیں بوسے کی تو پھر وہ بھی نہیں
ہاتھا چھانٹی نہیں کرتے ہیں قسم دیتے ہیں

کوئی مضمون پھڑکتا ہوا لکھنا شاعر
آج ہم پھر تمہیں قرطاس و قلم دیتے ہیں

آغا شاعر قزلباش